

راجندر سنگھ بیدی

گرہن

MEHRAN LIBRARY
B-61 Bhagorea Town
Azizabad Karachi
TIME 6 to 10 pm

نیا ادارہ ⊗ لاہور

افسانہ

پیش لفظ ،
گزشتہ ،
رحمن کے جوتے ،
جگہ ،
اسٹو ،
غلامی ،
پڑیاں اور پھول ،
زمین العابدین ،
لادوے ،

NEERAN LIBRARY
B-61 Bhongoria Town
Karachi
TIME 6 to 10 pm.

گھر میں بازار میں ،

دوسرا کنارہ ،

آؤ ،

مہارن اود میں ،

چپک کے داغ ،

ایوا لائنش ،

پیش لفظ

جیسے ہم کہتے ہیں کہ کسی دور کی صحت مندی اور طاقت کا اندازہ اس دور کے ادب کی حالت سے لگایا جاسکتا ہے ویسے ہی اس بات کا الٹ بھی درست ہے۔ یعنی ادب کی بچائی یا برائی کا اندازہ کسی دور کی صحت و تندرستی پر مبنی ہے۔ ہمارا ملک ایک خاص قسم کی سماجی و ذہنی غلامی اور غمرو کی حالت میں سے گزر رہا ہے اور وہ تمام طبی حقائق پر افادی ادب کی نگین کے لئے مہمساوین ثابت ہوتی ہیں ابھی صبح نہیں سمجھیں ہمارے ادیب ملازمتوں اور دیگر معین نامساعد حالات میں گھر سے جوڑے میں، نہ دن میں وفتروں میں نوہں گھٹنے ٹیک کر کے بعد نکلنے کی ادب پختہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان حالات میں جبکہ ان کے دماغ کو استراحت نہیں ان کے اعضا تھکاوٹ سے پور ہیں اور ہم کے تمام تو محض تو ہمارا ان کے متعلق اپنی توقعات کو بند کر لینا عیبت ہے۔

ایک نیا اور بہرہ ور کشتی میں ہے آدمی سے پہلے جو ایک خاص قسم کی آگ میں ہوتی ہے اس کا غور ہمارے ادب میں بھی ہے اس میں کوئی بھی سنسنی کوئی بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے بلکہ ایک خاص قسم کے تجریدی و اتنیاتی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن سے ہمیں تعشایا بوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ ترقی پسندی کے رکھنے والے ہم آپ کے تحت جو جنسی کچھ اچھا لاچار ہے اور جس سے لوگوں کو ادب کی موت مسخ ہو جانے کا بے بنیاد اندیشہ ہے ایک ایسے ہی انصاف طلبی اور کی ترغیبی کرتا ہے لیکن آج ایک ذرا صبر کہ فرد کے دن تھوڑے ہیں

ہیں تاہم یہی اور ایسا صحت کا مظاہر نہیں کرنا چاہئے۔

’واندھم‘ کے بعد میں انسانوں کا وہ مجموعہ پیش کرتا ہوں انسانوں کے مجموعے میں وہ تمام فطری کمزوریاں ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں لیکن میں باؤس نہیں اور بعد رحمت کے قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں غار کی نسبت میرے لئے نقبر معنوں کا سبز زیادہ ہیست رکھتا ہے! وہاں تک معنوں کا تعلق ہے جسے اولیٰ تخلیق زیادہ کامیاب ہوگی جو اپنے غور کے گرد گھومنے اپنے ماحول کے نزدیک ہے مثلاً ہم اپنے مزدور کی زبان کا یوں کہنے کے مزدور کی زبان میں ترجمہ کریں تو ہماری تخلیق ایک قابل صافی فصیح کی حامل ہوگی۔ میرا ماحول اگر چاہیے ہے اور میں بنجائی اسدو گھستا ہوں تو کوئی تصور نہیں کرتا بلکہ اپنے غرض کا ثبوت دیتا ہوں۔

اب میں اپنی نام کے متعلق ایک دو بات کہوں مجھے تخلیقی فن میں یقین ہے جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو میں اسے من و عنان کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے اسطرح تحریر میں لائے کہ کسی کرتا ہوں۔ میرے خیال میں انکار حقیقت کے لئے ایک روحانی نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہر سے کے بعد پیش کرنے کے انداز کے متعلق سوچنا بجا ہے خود کسی مذہب کا روحانی طرز عمل ہے امداس اعتبار سے مطلق حقیقت نگار کی حیثیت فن غیر موزوں ہے۔ اس مجموعے کے پہلے افسانے کی متوازیات PARALLELISMS میرے مطلب کی وضاحت کرتی ہیں۔ لیکن سب سے پہلے میرے ذہن میں نفس معنوں کا محض ظاہری PHYSICAL پہلو پیدا ہوا۔ یہاں تک تو شاہد سے کا تعلق تھا لیکن اس کے بعد میرے تخیل نے طنز کی صورت میں ایک باطنی پہلو کا نشان کر لیا ذہن و تحریر میں دونوں آپس میں یوں گھل مل گئے کہ محسوس طور پر ایک تاثر کی صورت اختیار کر لی اعلیٰ ہذا اقلیاس۔

رشی نگر لاہور

راجندر سنگھ بیدی

۱۱۸ مارچ ۱۹۴۲ء

رُودِ ایشیو اکتھو اور مٹا — ہولی نے اسارسی کے کاستھوں کو چار بچے دیئے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جھننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے، لکڑیوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور گوشت ان میں پک گیا۔ وہ ہولی جیسے پہلے پہل مٹیہ پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا رسیلا حاسد ہوتا گئے ہوتے پتے کی طرح زرد اور پڑ مردہ ہو چکی تھی۔

آج رات جاند گرہن تھا۔ سرشام چاند گرہن کے زمر میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پہن سکے — پیٹ میں بچے کے لمبے بھٹ جاتیں گے، وہ بھی نہ ملتی تھی — منہ سلا بچہ پیدا ہو گا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی — اس کے ڈیرے میڑے حروف بچے کے چہرے پر لکھے جائیں گے۔ اور اپنے میکے خط لکھنے لکھائے بڑا اجاز تھا۔

گرمی

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبہ سے کانپ اٹھتا ہو میکے
یعنی تو اس کے سسرال کا کتنا پاؤ تھا لیکن اب وہ سسرال سے اتنی میر ہو چکی تھی۔ کوہاں
بھاگ جاتا جا رہی تھی۔ اس بات کا اس نے کبھی مرتبہ تہیتہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ
نا کام رہی۔ اس کے میکے اس طرحی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھے۔ سمندر
کے کنارے ہر پھول بندر پر شام کے وقت شیر لہجہ ل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ
ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اس کے میکے گاؤں کے بڑے مندر کے قلم
خورد کلاس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی، چولا، تن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ مینا کہتی
تھی گرمی سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہئے ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر
پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گو پاؤہ بد زیب، فراخ تنھوں والی ٹیلی مینا اپنی بھوجیہ بانو
کے پیٹ سے کسی اکبر اعظم کی متوقعہ ہے! چار بچوں، تین مردوں، دو عورتوں اور چار بیسیوں
پرستش بڑا کنبہ اور اکیل ہولی — دو پہر تک تو ہولی پرستوں کا انبار صاف کرتی رہی۔
پھر ہانڈوں کے لئے بنولے، کھلی اور چنے بھگوئے چنے۔ حتیٰ کہ اس کے کوسٹے ورد
سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بغاوت گھر ہولی کر ڈیا دینے
والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ جوان شہت کے احساس سے چوکی پر بیٹھ گئی۔
لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر مینا کے خیال
کے مطابق چوڑی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا مہریشا ہو جاتا ہے۔
مونڈھا ہو کر اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی مینا اور کاستمیں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر
سیدھی پڑ جاتی اور ایک قسم پُرکتیا کی طرح ڈانگوں کو اچھی طرح سے پھیلا کر خیالی

گرہن

اور پھر اسی وقت کا پختہ ہوتے ہاتھ سے اپنے ننھے سے روزخ کو سہلانے لگی۔
 یہ خیال کرنے سے کہ وہ سیتل کی بیٹی ہے وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی، سیتل
 سارنگ دیو گروم کا ایک متمول سا ہوکار تھا اور سارنگ دیو گروم کے فواج کے میں گاؤں
 کے کسان اس سے بیاج پور روپیہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود اسے لاکسموں کے ہاں
 ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔ لاکسموں کو تو بچے
 چاہئیں۔ ہولی جہنم ہی جائے۔ گریا سارے گجرات میں یہ لاکسم ہی کل دو ہودل کو بڑھانے
 والی ————— ہو! الامیج مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کپڑا گھر میں رہیگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے
 تھے۔ اونچے کی وجہ سے کھایا چاہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے بدنی
 بھی اسی لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں کچھ بانگت ہے اور اسی لئے اسے حمل کے شروع
 پاٹ اور اب پھل آواز دینے جاتے تھے۔ —————

”دیور بے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے“ ہولی سوچتی تھی ”اور سائنس کے کوئی بار پیٹ
 سے کہیں بڑے ہیں۔ اور بڑے لاکسم سب ڈانٹنے مکتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی
 ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان بیٹھنے کا کیا حق ہے؟..... رسیلا کی بات تو دوسری
 ہے۔ شاستروں نے اُسے ہرمانا کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے اسے اسی چھری
 کا بھلا!..... لیکن کیا شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور تیا کی تو بات ہی
 علیحدہ ہے ————— شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے
 بھی زیادہ پابندیاں عائد کر لیتی.....“

..... راہوا اپنے ننھے بچیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند

گرہن

اور سورج نے دشنو ماراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سد رشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں ان کے مقرض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے پہلے لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی۔ بھگوان کے کیلن بھی نیا رہے ہیں۔ اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ ایک کالا سارک شس، شیر پر چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈراؤنا ہے۔ ریشل بھی تو شکل سے ناہموئی دکھائی دیتا ہے۔ مٹنا کی پیدا تیش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آموہو دہوا۔ کیا میں نے بھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ہاں بیٹے کے آنے کی بھنگ پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی سے تو سے کو دھڑی دھڑی آپرچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں بھکنے کی تاب نہ تھی کہ ہونکلیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے گوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آئے نکلیں۔

دسیلا ایک نیامرت کیا ہوا اچھا جاتھیں لے لے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے مینا آئی اور آتے ہی بولی۔
”دہو اناج رکھا ہے کیا؟“

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی ”ہاں ہاں رکھا ہے۔“ نہیں رکھا، یاد آیا، بھول گئی تھی مینا“

”تو بیٹھی کر کیا رہی ہے، نہاب جاوی؟“
ہولی نے رحم جو یا نہ بٹھہ ہوں سے ریشلے کی طرف دیکھا اور بولی ”جی، مجھ سے اناج کی پوری ہلائی جاتی ہے کہیں؟“

میتا لا جواب ہو گئی۔ اور یوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ ہر دھاتی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوتے ہولی۔
 ”تو نے سرمہ کیوں لگایا ہے ری؟“ رائڈ اجانتی بھی ہے آج گمن ہے جو بچہ اندھا ہو جاتے تو تیرے ایسی میسا اُسے پالنے چلے گی؟“

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گمارے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ اور سب جو جائے لیکن رائڈ کی ٹھالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میتا اور بھی کتنی تھکتی چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک چیلے شمع دان کے قریب سرمہ پیسنے کا کھل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ ریسلے نے ایک بڑے ہوس گچھا سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی ایکسی تھی۔ ریسلے نے آہستہ سے آنچل کو تھپو۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیوہ کو آواز میں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی کا حسی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ ریسلے آواز کو جھپٹتے ہوئے بولا:

”میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کا ہے کی تھی؟“

”جلدی کیسی؟“

ریسلے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ”بی..... تم بھی تو کیا ہو گیتا؟“

ہولی سم کو بولی: ”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

ہولی نے ناداشتگی سے ریسلے کو خوش آمدین، ہوس دان سبھی کچھ کہہ دیا۔ پوٹ سیدھی پڑی۔ ریسلے کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ لا جواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔

گھر

اس وقت تیا ماش کی ایک ٹوکری اٹھاتے ہوئے بھنڈا رے کی طرف سے آئی اور ہوسے بدسلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو بھڑکنے لگی۔ ہولی کو ریلے پر توجہ نہ دیا۔ البتہ تیا کی اس حادث سے جل بھن گئی۔ رانڈ، آپ مارے تو اس سے بھی زیادہ اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے، بڑی آئی ہے.....
 ہولی سوچتی تھی کل کس بیلا نے مجھے اس لئے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور آج اس لئے مارا ہے کہ میں نے بات کا جواب دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے۔ کیوں لگایاں دیتا ہے میرے کھانے پکانے، اٹھنے بیٹھنے میں اسے کیوں سلیقہ نہیں رکھاتی دیتا..... اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں، یہ مرد.....!

تیا نے کچھ باس مٹی، دالیں اور نمک وغیرہ رسوئی میں کچھ بھر دیا اور پھر ایک بیسلی ہوتی رازوں اسے تولنے لگی۔ ترازو گیلان تھا یہ تیا بھی دیکھ رہی تھی اور جب باس اتنی جانول پندرے میں چمٹ گئے تو بہو مرقی کو پیچھڑ پڑ گئی اور آپ اتنی سکھڑ کہ نئے دوپٹے سے پیندا صاف کرنے لگی جب بہت میل ہو گیا تو دوپٹے کو سر پر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور ہولی۔
 ”لے دو ڈال“

اب ہولی نہیں جانتی بچاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بولے یا نہ بولے، بٹے یا نہ بٹے، وہ کتیا ہے یا ناب بادی۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصروف تھی۔ اس وقت پانڈ گرہن کے زمرہ میں داخل ہونے والا ہی ہو گا۔ کچھ دیر بعد ہونے

گرہن

کپڑے کی طرح چوڑا سپردا ہو گا اور اگر ماہ و ماہ بعد بچے کا بڑا سا چہرہ دیکھ کر اسے کو سا جانتے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟..... لیکن تصور اور بے تصوری کی تو بات ہی طبعہ ہے کیونکہ یہ کوئی سنسنے کے لئے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے، سب گناہ ہولی کا ہے۔

اسی وقت ہولی کو سارنگ دیو گرہم یاد آگیا۔ کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گرباناچا کرتی تھی۔ اور بھائی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی اس وقت سب عورتیں اپنے خاامیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجا یا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں۔

ماہندی تو ادی مالوے اینورنگ گیو گجرات سے

ماہندی رنگ لاگیو سے

اس وقت وہ ایک اچھلنے کو نہنے والی اٹھڑ چھوڑی تھی، ایک بحر و قانیہ سے آزاد نظم جو چاہتی تھی پورا ہر جاتا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ بناب جاوی تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں ——— دو بھی اپنے اپنے ترفن خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی۔
..... عازنگ دیو گرہم میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان ہن کیا جاتا ہے۔ عورتیں اٹھی ہو کر توبیدی گھاٹ پر ہشمان کے لئے چل جاتی ہیں۔ پھولی، ناریل، تباٹھے

ماہندی اٹھا تو مالہ ——— وسط ہند میں پیدا ہوئی۔ اس میں گجرات رنگا ہوا ہے۔ (گو یا) اسے خاکا رنگ چڑھ گیا ہے۔

سمندر میں باقی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال منہ کھولے ہوئے آتی ہے اور سب پھول
پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے ہشتان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں
کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سال کیستے رہے ہیں۔
اشنان سے سب پاپ و عمل جلتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی
لہروں کے سب گناہوں کو ہا کر دور بہت دور — ایک نامعلوم، ناقابل عبور
ناقابل پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے۔ ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن
گناہوں سے آلود ہو جاتے ہیں، پھر گناہ جاتے ہیں۔ پھر دیا کی ایک لہر آتی ہے
اور پھر پاک و صاف۔

جب گڑھن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عنصرت پر داغ لگ جاتا ہے
تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر ہم نام کا باپ شروع ہوتا ہے،
پھر ٹھنڈے، ناقوس، شعلہ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور و غوغا میں اشنان کے بعد
حب مرد عورتیں سمجھنے کی صورت میں گاتے بجاتے ہوئے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔
گر جن کے دریاں میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں بنگلے
جیسا کھجیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کھسکول تھامے لپیک کے چوہوں کی طرح
ایک دوسرے پر گرتے، پڑتے بھاگتے چلتے جاتے ہیں کیونکہ راہب اور کیستے نے خوبصورت
چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ نرم دل ہندو ان ریتا ہے تاکہ
غریب چاند کو تھوڑا دیا جائے اور ان لینے کے لئے بھاگنے والے بھکاری بھیڑوا
چھوڑ دو، وان کا وقت ہے — چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے مسیلوں کی
مسافت طے کر لیتے ہیں۔

چاند گرہن کے زمرہ میں آسنے والا ہی تھا۔ ہولی نے بچوں کو بڑے لاسٹھ کے پاس
بھجوا دیا۔ ایک میل پہلی و صوفی بانڈھی اور عورتوں کے ساتھ ہر بھول بندر کی طرف اٹھان
کے لئے چلی۔

اب سیارہ سیلا، بڑا لڑکا شبہ اور ہولی سب مندر کی طرف جا رہے تھے۔
ان کے انگوٹھیں بھول تھے۔ گجرے تھے اور آم کے پتے تھے اور بڑی اماں کے
انگوٹھیں رودر کش کی مالا کے علاوہ مشک کا نور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا
دینا چاہتی تھی تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی
تھی۔ کیا اس کے گناہ مندر کے پانی سے رمل جائیں گے؟

مندر کے کنارے لگاٹ سے پون میل کے قریب ایک لاپنج کھڑا تھا۔ وہ جگہ
ہر بھول بندر کا ایک حصہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے نامور ساحل اور ایک مختصر سے
ڈاک پر کچھ ٹینڈل غروب آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کش مکش کے خلاف نیلے
نیلے بے بضاعت سے خاک کے جا رہے تھے اور لاپنج کے کسی ایکسین سے ایک بلی
سی ٹھٹھائی ہوئی روشنی سیلاب وار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک چرخی
سی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اثر و اتار سے کو
کیچنے لگے۔ آٹھ بجے سٹیم لاپنج کی آخری سیٹی تھی۔ پھر وہ سارنگ ویدر گرام کی طرف
روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے
ہوئے گویا صدیوں سے آتش ناکس دکھائی دینے لگیں۔۔۔۔۔ اور پھر یہی اماں۔۔۔
۔۔۔۔۔ کنڈاپن اور گر باناچ!

ہولی نے ایک نظر سے شبہ کی طرف دیکھا۔ شبہ حیران تھا کہ اس کی ماں نے انہی

گرمی

بھیڑ میں جبکہ کہ اس کا منہ کیوں چوم اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آ پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر ریلے کی انگلی پکڑ لی۔ اب گھاٹ اچکا تھا جہاں سے مرو اور عورتیں طعیدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لئے۔ اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پراسرار بعید انغمص طاقت ہے۔ اور دور سے لاپنج کی ٹمٹائی ہوئی روشنی ہوئی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ جھک بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوٹی کر کس کر باندھا۔ دھوٹی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی۔ اور دھوٹے میں وہ لاپنج کے سامنے کھڑی تھی۔ لاپنج کے سامنے نہیں۔ سارا رنگ دیوگرام کے سامنے۔ وہ کلاس روم کے گھنٹے، لاپنج کی سیٹی، اور ہولی کو یاد آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ کے لئے بھی بیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لاپنج کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹینڈل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پاتے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ کچھ دیر بعد ملازموں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کتنی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا۔ مرغی۔ دوسلے۔ پایاں میرے پاس ہیں۔ پانی زیادہ ہو گا۔

اس کے بعد چند خوشیاں تھیں بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین پارہ آموی ہولی کے لاپنج کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلتے گئے اسی وقت آجاری کا ایک سپاہی

گرہن

لایچ میں وارد ہوا عین جبکہ دنیا بولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی بولی کو امید کی ایک شمع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیو گرام کا ہی ایک چھوٹا تھا اور میکے کے رشتے سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی آنکھوں کے ساتھ لگاؤں سے باہر نکلا تھا اور ساربتی پھانڈ کر کسی نامعلوم دیس کو پہنچ گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا ہو جاتے ہیں۔ بولی نے سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیا۔ اور کچھ دیر ہی سے بولی:

”کتھورام“

کتھورام نے بھی تیل کی چھوٹری کی آواز پہچان لی۔ بچپن میں وہاں کے ساتھ کھیلا تھا۔

کتھورام بولا —

”ہوئے“

بولی یقین سے صوگر گھرائی ہوتی آواز میں بولی ”کتھو بھیا۔۔۔۔۔ مجھے سارنگ دیو گرام پہنچا دو۔۔۔۔۔“

کتھورام قریب آیا۔ ایک ٹینڈل کو گھورتے ہوئے بولا۔

و سارنگ دیو ہاؤس ہوئے؟“ اور پھر سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب

ہوتے ہوئے بولا ”تم نے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی؟“

ٹینڈل بوسب سے قریب تھا بولا:

”بھاری کوئی دیکھا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ

رہے تھے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

گرھن

کتھورام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لاپنج سے نیچے اتر آیا۔ ڈاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا:

”وہ بولے..... کیا تم اسارمھی سے بھاگ آئی ہو؟“

”اں“

”یہ سر بیچہ جادویوں کا کام ہے؟..... اور جو میں کاستھوں کو خبر کر دوں تو؟“

ہولی ڈر سے کانپنے لگی۔ وہ ز تو نباب جادوی تھی اور نہ سر بیچہ جادوی۔ اس جگہ اور ایسی حالت میں وہ کتھورام کو کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوتی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے سامنے لاپنج کے رستے ڈھیلے کئے گئے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور بولے ہوئے سارنگے یوگرتم ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھنا۔ لاپنج کی ہلکی سی روشنی میں اسے بھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لاپنج کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کتھورام بولا ”ڈر و نہیں بولے..... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پو پھیٹے لے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات سراسے میں آرام کرو۔“

کتھورام ہولی کو سراسے میں لے گیا۔ سراسے کا مابک بڑی ہیرت سے کتھورام اور اس کے ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا۔ تو اس نے کتھورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا۔

”یہ کون ہیں؟“

گھر میں

کتھورام نے آہستہ سے جواب دیا "میری مہنی ہے۔"
 ہولی کی آنکھیں پتھر بن گئیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو ہارادیا اور دیوار
 کا ہار اسے کر بیٹھ گئی۔ کتھورام نے مہرے میں ایک کمرہ کراتے پر لیا۔ ہولی نے دڑتے
 ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کتھورام اندر آیا تو اس کے منہ سے شراب
 کی بو آ رہی تھی۔

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب بھول، پتاشے، آم کی ٹنڈیاں گرجے
 ادا جلتا ہوا مشک کا فربہ اکر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے عیب ترین گناہ بھی
 لیتے گئی۔ — دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش
 سمندر کی طرف جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی پھر شکمہ بچنے
 لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سر پٹ، گھٹٹ
 وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، اپٹ پکڑ کر پیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی
 اس وقت آسمان پر چاند پورا گستا جا چکا تھا۔ راہب اور کیتھونے بھی بھر کر قرصہ
 وصول کیا تھا دو دھندلے سے سرائے اس عورت کی مدد کے
 لئے سرا سیدہ اوہرا ہر دڑ رہے تھے چار دیں طرف اندھیرا
 ہی اندھیرا تھا اور دور، اسٹری سے لمبی ہلی آوازیں آرہی تھیں —
 دان کا وقت ہے

پھوڑو پھوڑو پھوڑو
 ہر پھول بند سے آواز آتی —

گرہن

پکڑ لو..... پکڑ لو..... پکڑ لو.....

.....

.....

پھوڑ دو..... دان کا دقت ہے..... پکڑ لو.....

پھوڑ دو!!

رحمان کے عوتے

دن بھر کام کرنے کے بعد جب بڑھار رحمان گھر پہنچا تو بھوک اسے بہت سارہی
 تھی۔ جینا کی ماں، جینا کی ماں، اس نے چلاتے ہوئے کہا — کھا نا کال دے بس
 بھٹ سے۔ بڑھیا اس وقت اپنے ہاتھ کپڑوں لتوں میں گیلے کتے میٹھی تھی اور شیراز
 کے کہ وہ اپنے ہاتھ پونچھ لے رحمان نے ایک دم اپنے ہوتے کھاٹ کے نیچے آکر
 دیئے اور کھد ر کے ملتانى تہمد کو زانوؤں میں دبا، کھاٹ پر پوکر دہی جھاتے ہوئے
 بولا — بسم اللہ!

بڑھاپے میں بھوک جوان ہو جاتی ہے۔ رحمان کی بسم اللہ بڑھاپے اور جوانی کی اس
 دوڑ میں رکابی سے بہت پہلے اور بہت دور نکل گئی تھی اور ابھی تک بڑھیا نے سبکی اور
 نیل میں بھگوئے ہوئے ہاتھ وہ پٹے سے نہیں پونچھے تھے۔ جینا کی ماں برابر چالیس مال

گرمین

سے اپنے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی آئی تھی اور رحمان قریب قریب اتنے ہی عرصے سے خفا ہوتا آیا تھا لیکن آج یک لخت وہ خود بھی اس وقت بچانے والی عادت کو سراہنے لگا تھا۔ رحمان بولا۔ جینا کی ماں، جلدی ذرا۔۔۔۔ اور بڑھیا اپنی چولیس سالہ، وقیا کو سی اداسے بولی، آتے ہستے، ذرا دم توڑے بابا تو!

سور اتفاق رحمان کی بجائے اپنے جوتوں پر جا لکھی جو اس نے جلدی سے کھاٹکے نیچے آ کر دیئے تھے۔ رحمان کا ایک جوتا دوسرے جوتے پر چڑھ گیا تھا۔ یہ مستقبل قریب میں کسی سفر پر جانے کی علامت تھی۔ رحمان نے ہستے ہوئے کہا:

آج پھر میرا جوتا جوتے پر چڑھ رہا ہے، جینا کی ماں — اللہ جانے میں نے کون سے سفر پر جانا ہے!

جینا کو کتنے جانا ہے اور کہاں جانا ہے؟ — بڑھیا بولی، یونہی تو نہیں تیرے گود رو دھو رہی ہوں، بڑھے! وہ پیسے ڈیل کا تو نیل ہی لگ گیا ہے تمہارے کپڑوں کو۔ کیا تو وہ پیسے روح کی کمانی بھی کر سکتے ہے؟

ہاں ہاں! بڑھے رحمان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ کل میں نے اپنی اکلوتی بچی کو کتنے انبالے جانا ہے۔ تبھی تو یہ جوتا جوتے سے نیا را نہیں ہوتا۔ پارہ رالی بھی جب یہ جوتا جوتے پر چڑھ گیا تھا تو رحمان کو پرچی ڈالنے کے لئے ضلع کپری جانا پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں اس سال کا سفر اور جوتوں کی کوڑت اچھی طرح سے محفوظ تھی۔ ضلع کپری سے واپسی پر اسے سپرل ہی آنا پڑا تھا۔ کیونکہ ہونے والے ممبر نے تو واپسی پر اس کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ اس میں ممبر کا قصور نہ تھا۔ بلکہ حبیب رحمان پرچی پر نیلی چوٹی کا نشان ڈالنے لگا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس نے گھبرا کر پرچی کسی دوسرے ممبر کے حق میں دیدی تھی۔

جینا کو ملے دو سال ہونے کو آتے تھے۔ جینا ابانے میں بیباکی ہوئی تھی۔ ان دو سالوں میں آخری چند ماہ رحمان نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ اسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دیکھتا ہوا اُپلا اس کے دل پر دکھا ہوا ہے۔ جب اسے جینا کو ملنے کا خیال آتا تو اسے کچھ سکون، کچھ اطمینان میسر ہوتا۔ جب ملنے کا خیال ہی اس قدر تسکین دہ تھا تو ملنا کیسا ہوگا؟ — بدصالح رحمان بڑی حیرت سے سوچتا تھا۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو ملے گا اور پھر تفتنوں کے سردار علی محمد کو۔ پہلے تو وہ رو دے گا۔ پھر منہس دے گا، پھر روہ سے گا اور اپنے ننھے نواسے کو سے کرے گا۔ بازاروں میں کھلاتا پھرے گا۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا، جینا کی ماں از رحمان نے گھاٹ کی ایک ٹھلی ہوئی رسی کو عادتاً جھسا کر کاٹتے ہوئے کہا — بڑے پیسے کی یادداشت کتنی کمزور ہوتی ہے۔

علی محمد جینا کا خاوند، ایک وجہہ جوان تھا۔ سپاہی سے نرالی کرتے کرتے وہ نائیک بن گیا تھا۔ منگے اسے اپنا سردار رکھتے تھے۔ صلح کے دنوں میں علی محمد بڑے جوش و خروش سے ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ این۔ ڈبلیو۔ آر، پولیس ریز، برگیدو اسے، یونیورسٹی واسے اس نے سب ہرا دیتے تھے۔ اب تو وہ اپنی ایسی کے ساتھ بھرے جانے والا تھا۔ کیونکہ عراق میں رشید علی بہت طاقت پر چمکا تھا۔ اس ماک کی بددلت ہی علی محمد کمپنی کمانڈر کی نگاہوں میں اونچا اٹھ گیا تھا۔ نائیک بننے سے پہلے دو جینا سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا لیکن اس کے بعد وہ اپنی ہی نظروں میں اتنا بلند ہو گیا تھا کہ جینا اسے پاؤں تلے نظر نہ آتی تھی۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ مسز بولٹ، کمپنی کمانڈر کی بیوی نے تقسیم انعامات کے وقت انگریزی میں علی محمد سے کچھ کہا تھا جس کا ترجمہ صوبیدار نے کیا تھا — میں بدلتی ہوں تمہاری اسٹاک جو م لوں۔ علی محمد کا خیال تھا کہ

گرہن

لفظ اسٹک نہیں ہو گا، کچھ اور ہو گا۔ بڑا حامد ہے صوبیدار، مگر زبانی بھی تو بس گوہار نے کہہ ہی جانتا ہے۔

رحمان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے اپنے داماد سے نہیں بلکہ کسی بہت بڑے افسر سے ملنے جانا ہے۔ اس نے کھاٹ پر سے جھک کر جوتے پر سے جوتا اتار دیا۔ گویا وہ ابلے جانے سے گھبراتا ہو۔ اس سرے میں جینا کی ماں کھانا لے آئی۔ آج اس نے خلاف معمول لگنے کا گوشت پکا رکھا تھا۔ جینا کی ماں نے گوشت بڑی شکل سے قبضے سے منگوایا تھا۔ اور اس میں گھی اچھی طرح سے چھوڑا تھا۔ چھ ماہ پہلے رحمان کو تلی کی سخت شکایت تھی۔ اس لئے وہ تمام سولداست مسودا، گڑ، نیل، بیگن، مسود کی دال، گائے کے گوشت اور چکنی خدا سے پرہیز کرتا تھا۔ اس چھ ماہ کے سرے میں رحمان نے شاید سیر کے قریب فوٹو سٹوڈیو کے ساتھ گھول کر پی لیا تھا تب کہیں اس کے سانس کی تکلیف و درہوتی تھی۔ بھوک لگنے کے علاوہ اس کے چشام کی سیاہی سپیدی میں بدل تھی۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی ویسے ہی نمایاں تھی۔ چلوں پر کی بھر بھرا ہٹ بھی قائم تھی۔ اور سب کا رنگ سیاہی مائل نیلیوں ہو گیا تھا۔ گائے کا گوشت دیکھ کر رحمان غصا ہو گیا۔ بولا۔۔۔ چار پانچ روز ہوئے تو نے بیگن پکاتے تھے جب میں چپ رہا۔ پرسوں مسود کی دال پکائی جب بھی چپ رہا۔ تو تو بس چاہتی ہے کہ میں بڑوں ہی نہیں۔ مری مٹی کا پور ہوں۔ ہر کتا ہوں تو مجھے مارنے چاہتی ہے۔ جینا کی ماں !

بڑے میا پہلے روز سے ہی جب اس نے بیگن پکاتے تھے، رحمان کی طرف سے اس احتجاج کی متوقع تھی لیکن رحمان کی خاموشی سے بڑے میا نے اٹھا ہی مطلب لے لیا وہاں بڑے میا نے قریب قریب ایک کھمبو آدمی کے لئے اپنا ذائقہ بھی ترک کر ڈالا تھا۔ بڑے میا کا سوچنے

گرفت

کا ڈھب بھی نیا رانگھا۔ جب سے وہ سپیٹ بڑھے ہوئے اس ڈھانچ کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی۔ اس نے شکوک ہی کیا یا رانگھا۔ بھلا چنگار رحمان لدھیانے میں سپاہی تھا لیکن ایک تر بوز پر سے پھسل کر گھٹنا توڑ بیٹھنے سے اس نے فیشن پال تھی اور گھر میں بیٹھ رہا تھا۔ بڑھیا نے کپڑے بچھاٹتے ہوئے کہا — فونہ کھا بابا — قیری کھا طر میں تو نامزد دل، مجھے تو روج والی روج والی میں کچھ محامی نہیں دکھے۔

رحمان کا بھی چاہتا تھا کہ وہ کھاٹ کے نیچے سے جوتا اٹھا لے اور اس بڑھیا کی چنیا پر سے رہے رہے پاؤں کا بھی صفایا کر دے۔ مگر کیشم کے اترتے ہی بڑھیا کا دائی نذر بھی دور ہو جائے گا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں ڈالنے کے فوراً بعد ہی اسے خیال آیا۔ بڑی ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ کتنا ذاتی دار گوشت پکایا ہے میری جینا کی ماں نے۔ میں تو ناشکرا ہوں پورا پورا۔ اور رحمان چٹارے لے لے کر ترکاری کھانے لگا۔ سالن کا تر کیا ہوا لقمہ جب اس کے منہ میں جاتا تو اسے خیال آتا۔ آخر اس نے جینا کی ماں کو کون سا کھہہ رہا ہے؟ وہ چاہتا تھا کہ اب تحصیل میں چپرا ہی ہو جاتے اور پھر اس کے پرانے دن دہریں آجائیں۔ کھانے کے بعد رحمان نے اپنی انگلیاں پگڑی کے شملے سے پکھیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نیم خموری اسکس سے اس نے لپٹے جوتے اٹھائے اور انہیں دالان میں ایک دھڑ سے اچھی طرح علیحدہ علیحدہ کر کے ڈال دیا۔

لیکن اس سفر سے چٹکا را نہیں تھا ہر چند کہ اپنی آٹھ روزہ قیام میں ملائی لازمی تھی۔ صبح والا دن میں جھاڑو دیتے ہوئے برصغیر نے بے احتیاطی سے رحمان کے موتے سر کا دیئے اور جرتے کی اٹھی دوسری ایڑی پر چڑھ گئی۔ شام کے قریب ارادے پست ہو جاتے ہیں۔

گرمن

سوئے سے پہلے ابلالے جانے کا خیال رحمان کے دل میں کچا پکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ترائی میں لذتی کر چکنے کے بعد ہی وہ کہیں جلتے گا۔ اندنیز کل کی مرغن غذا سے اس کے پیٹ میں پھر کوئی نقص واقع ہو گیا تھا۔ لیکن صبح جب اس نے پھر سوتوں کی حالت دیکھی تو اس نے سوچا اب ابلالے جاسے بنا چٹکارا نہیں ہے۔ میں لاکھ انکار کروں لیکن میرا وانہ پانی، میرے جوتے بڑے پردیں ہیں۔ وہ مجھے سفر پہ جانے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور صبح کے وقت ارادے بلند ہو جاتے ہیں۔ رحمان نے پھر اپنا جوتا سیدھا کیا اور اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

نیاں میں دھلے ہوئے کپڑے سوکھ کر رات ہی رات میں کیسے اچلے ہو گئے تھے۔ نیلا ہٹ نے اپنے آپ کو گھور کر سپیدی کو کتنا ابھار دیا تھا۔ جب کبھی بڑھیا نیل کے بغیر کپڑے دھوتی تھی تو یونی وکھائی دیتا تھا جیسے ابھی انہیں جو ہڑ کے پانی سے نکالا گیا ہو اور پانی کی ٹیالی رنگت ان میں یوں بس گئی ہو جیسے پاگل کے دماغ میں دواہلس جاتا ہے۔

جینا کی ماں اچھلی میں سواتر دو تین دن سے جو کوٹ کر تندر بنا رہی تھی۔ گھر میں عرصہ سے پرانا گڑ پڑا تھا جسے دھوپ میں رکھ کر گڑ سے نکال دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ سوکھی گئی کے بیٹھے تھے۔ گویا جینا کی ماں بہت دنوں سے اس سفر کی تیاری کر رہی تھی اور جوتے کا جوتے ہر پڑھنا تو محض اس کی تصدیق تھی۔ بڑھیا کا خیال تھا کہ ان تندرہوں میں سے رحمان کا زادہ راہ بھی ہو جائے گا اور جیٹ کے سئے سوغات بھی۔

رحمان کو کوئی خیال آیا۔ بولا۔۔۔۔۔ جینا کی ماں، بھلا کیا نام رکھا ہے انہوں نے اپنے ننھے کا؟

بڑھیا ہنستے ہوئے بولی۔۔۔۔۔ راہتی (اسحاق) رکھا ہے نام، اور کیا رکھا

گرفن

ہے ہم انوں نے اپنے ننھے کا۔ دادا اچھ بچ کتنی گجور ہے تیری یاد دہش۔
اسحاق کا نام بھلا رحمان کیسے یاد رکھ سکتا تھا۔ جب وہ خود بھی ننھا تھا تو اس کے
دادا کو بھی رحمان کا نام بھول گیا تھا۔ دادا لکھا تا پیتا آدمی تھا اس نے پاندی کی ایک تختی
پر عربی لفظوں میں رحمان لکھا کر اسے اپنے پیستے کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ لیکن پڑینا
کے بتاتا تھا۔ بس وہ تختی کو دیکھ کر منس دیا کرتا تھا۔ ان دنوں تو تمام گاموں، شیرا، بستو،
غبار وغیرہ ہی ہوتے تھے۔ استحق اشعیب وغیرہ نام تو اب قصبائی لوگوں نے رکھنے شروع
کر دیئے تھے۔ رحمان سوچنے لگا۔۔۔۔۔ سابق اب تو ڈیرہ بدخس کا بوچکا ہو گا۔ ابا
اس کا سر بھی نہیں جھونتا ہو گا۔ وہ گردن اٹھا میری طرف ٹپک ٹپک دیکھتا جاتے گا اور
اپنے ننھے سے دل میں سوچے گا۔ اللہ جانے یہ بابا، چٹے بالوں والا بوڑھا ہمارے
ہاں کہاں سے آٹھکا۔ وہ نہیں جانے گا کہ اس کا اپنا بابا ہے، اپنا نانا جس کے گوشت
پوست سے وہ خود بھی بنا ہے۔ وہ چپکے سے اپنا منہ جینا کی گود میں چھپالے گا۔ میرا
جی چاہے گا جینا کر بھی اپنی گود میں اٹھائوں۔ لیکن جوان بیٹیوں کو کون گودنی میں اٹھاتا
ہے۔۔۔۔۔ ناہی اتنی بڑی ہو گئی جینا بچپن میں وہ جب کھیل کود کر باہر سے آتی تھی تو
اسے سینے سے لگا لینے سے کتنی ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان دنوں یہ دل پرسلگتا ہوا اُپلا رکھا
نہیں محسوس ہوتا تھا۔۔۔۔۔ اب وہ عمر اسے دور سے ہی دیکھ سکے گا۔ اس کا سر
پیار سے چوم لے گا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ کیا وہی تسکین حاصل ہو گی؟

رحمان کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ ان سب کو دیکھ کر بے اختیار رو پڑے گا۔ وہ آنسو تھامنے کی لاکھ کوشش کرے گا۔ لیکن وہ اپنی آپ چلے نہیں گئے۔ وہ اس سے نہیں ہٹیں گے کہ تنہا اس کی جڑی کو بیٹھا ہے۔ جلد زبان کے طویل قصوں کی بجائے انکھوں سے

گرمی

اس بات کا اظہار کر دے گا کہ جینا، میری بیٹی، تیرے پیچھے میں نے بہت کڑے دیکھے ہیں۔ جب چودہ ہری خوشحال نے مجھے مارا تھا تو اس وقت میری کمر بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ میں مرتے تو چلا تھا۔ پھر تو کساں دیکھتی اپنے ابا کو؟ لیکن بنائی کوئی نہیں مرا شاید میں تمہارے پاس ہوتے یا کسی اور نیک بخت کے پاؤں کی خیرات پہنچ رہا۔

..... اور کیا نسخے کا لہو جوش مارنے سے رہ جاتے گا؟ وہ ہلک کر چلا آئے گا میرے پاس، اور میں کہوں گا۔ ساجی بیٹا، دیکھ میں تیرے لئے لایا ہوں تندرل، اور گڑ، اور کھلونے اور..... بہت کچھ لایا ہوں۔ ہاں، گاؤں کے لوگوں کا یہی گریہ ہی وہی ہو تا ہے۔ تنہا شکل سے دانستوں میں بچوں کے ٹکاسی ہرے بھٹے کو، اور جب تنگ سے میری تو تیرے میں ہوگی تو میں اسے خوب کھری کھری سناؤں گا۔ بڑا بھگتا ہے اپنے آپ کو۔ لال کی کھری اور..... اور..... وہ ناراض ہو جائے گا کھٹے گا، گھر رکھو اپنی بیٹی کو..... پھر میں اس کے لئے کھاتے پھرے گا۔ لال ٹل، بازار بازار..... اور میں جائے گا تنگ۔

رحمان نے غلامی کا بندوبست کیا۔ کھڑی کھیتی کی قسم پر کچھ روپے ادا کر لئے۔ سوغات باندھی۔ زاد راہ بھی۔ اور بیکے پر پاؤں رکھ دیا۔ بڑھیا نے اسے اللہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ بھرے چلا جاتے گا علیا چند روج میں میری جینا کو ساتھ ہی لیتے آنا اور میرے راجے کو، کون جانے کب دس نکل جائے۔

لکھ رانی سے مانگ پور پہنچتے پہنچتے رحمان نے اسماعیل کے لئے بہت سی چیزیں خرید لیں۔ ایک سچوٹا سا شیشہ تھا۔ ایک سیلولائیڈ کا جاپانی، بھینچنا جس میں نصف دو سو

کے قریب گھنگھرو ایک دم بج اٹھتے تھے۔ مانک پور سے رحمان نے ایک چھوٹا سا گڈریا بھی خرید لیا تاکہ اسحاق اسے پکڑ کر چلتا سیکھ جائے۔ کبھی رحمان کتا اللہ کرے۔ اسحاق کے دانت اس قابل ہوں کہ وہ دو بھٹے کھا سکے۔ پھر ایک دم اس کی غماش ہوتی کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ چلنا بھی نہ سیکھا ہو اور جینا کی پڑوسیں جینا کو کیوں — ننھے نے تو اپنے نانا کے گڈریے پر چلنا سیکھا ہے۔ اور رحمان نہیں جانتا تھا کہ وہ ننھے کو بڑا دیکھنا چاہتا ہے یا بڑے کو ننھا۔ صرف اس کی غماش تھی کہ اس کے تندل اس کے بھٹے اس کا شیشہ اس کا مایا پانی بھینچنا اور باقی خریدی ہوئی چیزیں سب سہل ہوں۔ انہیں وہ مقبولیت حاصل پر جس کا وہ متحی ہے کبھی وہ سوچتا کیا جینا لگاؤں کے گنوار لوگوں کے ان نکتے کو پسند کرے گی؟ کیا ممکن وہ محض اس کا دل رکھنے کے لئے ان چیزوں کو پاکر باغ باغ ہو جائے لیکن کیا وہ صرف میرا جی رکھنے کے لئے ہی ایسا کرے گی؟ پھر تو مجھے بہت دکھ ہو گا۔ کیا میرے تندل پر سچ اسے پسند نہیں آ سکتے؟ میری بیٹی کو میری اپنی جینا کو چلیا تو پراپا پیٹ ہے وہ تو کچھ بھی نہیں پسند کرنے لگا۔ وہ تو نایک ہے۔ اللہ جانے، صاحب لوگوں کے ساتھ کیا کچھ کھانا ہو گا۔ وہ کیوں پسند کرنے لگا لگاؤں کے تندل اور مانک پور سے روانہ ہوتے ہوئے رحمان کا اپنے لگا۔

رحمان پر سمجانی اور ذہنی تھکاوٹ کی وجہ سے غمو دگی سی طاری ہو گئی۔ رات کے گوشت نے اس کے پیٹ کا شیطان بجا دیا تھا۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی تو تھی ہی، لیکن کچھ سفر کچھ سرغن غذا کی وجہ سے آنکھوں میں سے شعلے پکینے لگے۔ رحمان نے اپنے پیٹ کو دبا دیا۔ تلی والی جگہ پھر غس می معلوم ہوتی تھی۔ جینا کی ماں نے اسے لہائے لگاؤشت پکایا۔ لیکن اس وقت تو اسے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتا اور لہائے لگاؤشت درزوں

میزیں پسند آئی تھیں۔

رحمان کو ایک جگریشاب کی حاجت ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اس کا تارور کسبیا ہی مائل گدلا تھا۔ رحمان کو پھر دم ہو گیا۔ بہر حال، اس نے سوچا، مجھے پرہیز کرنا چاہئے۔ پرانا مرض پھر ہو کر آیا ہے۔

گھاڑی میں، کھڑکی کی طرف سے، شمال ہوا فراٹے بھرتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی۔ درختوں کے نفل کے سامنے ٹھونسنے کبھی آنکھیں بند کرنے اور کھولنے سے رحمان کو گھاڑی بالکل ایک پنڈورے کی طرح آگے پیچھے جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دو تین سٹیشن ایک اور ٹھڈی میں نکل گئے۔ جب وہ کرنال سے ایک سٹیشن ورے ہی تھا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی سیٹ کے نیچے سے گھڑی اٹھالی گئی تھی۔ صرف اس کے اپنے گزرنے کے لئے تندرل اور جاوڑ کے پلوں بندھے ہوئے کئی کے بھٹے وہ گئے تھے۔ یا اس کے پھیلے ہوئے پاؤں میں گڈیرا کھڑا تھا۔

رحمان شور مچانے لگا۔ اس ڈبے میں ایک دو اچھی وضع قطع کے آدمی اخبار پڑھ رہے تھے۔ ڈبے کو یوں سیخ پا ہوتا دیکھ کر چلا تے مت شور مچاؤ، اسے بڑھے، مت غل کرو۔ لیکن رحمان بولتا چلا گیا۔ اس کے سامنے ایک بیٹی ہوئی مونچھوں والا ٹنٹیل بیٹھا تھا۔ رحمان نے اسے پکڑ لیا اور بولا تو نے ہی میری گھڑی اٹھواتی ہے بیٹا۔۔۔۔ ٹنٹیل نے ایک جھٹکے سے رحمان کو پرے پھینک دیا۔ اس کھینچا تانی میں رحمان کا دم بھول گیا۔ بابو پھر بولے۔ تو سو کیوں گیا تھا بابا؟ تو سنبھال کے رکھتا اپنی گھڑی کو تیری عقل پر نے گئی تھی بابا۔

رحمان اس وقت ساری دنیا کے ساتھ لڑنے کو تیار تھا۔ اس نے ٹنٹیل کی وردی

بھاڑ ڈال۔ کاسٹل نے گڈیرے کا لٹھا کھینچ کر رحمان کو مارا۔ اسی اثنا میں ٹکٹ چیکر نے نکل ہوا۔ اس نے بھی خوش پوش لوگوں کی راستے کا پتہ دیکھ کر رحمان کو گالیاں دینا شروع کیا اور رحمان کو حکم دیا کہ وہ کرنال پہنچ کر گاڑی سے اتر جائے اسے ریلوے پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ چیکر کے ساتھ لڑائی میں ایک لات رحمان کے پیٹ میں لگی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔

کرنال آچکا تھا۔ رحمان، اس کی چادر اور گڈیرا پلیٹ فارم پر اتار دیئے گئے۔ گڈیرے کی لٹھ، جسم سے علیحدہ، خون میں مٹی ہوئی ایک طرف پڑی تھی اور کئی کے بچے کھلی ہوئی چادر سے نکل کر فرش پر لڑکھا رہے تھے۔ رحمان کے پیٹ میں بہت چوٹ لگی تھی۔ اسے سڑک پر ڈال کر کرنال کے ریلوے ہسپتال میں لے جایا گیا۔

جینا، سامتھا، علی محمد، جینا کی ماں ایک ایک کر کے رحمان کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ زندگی کی ظلم کتنی سمجھتی ہے۔ اس میں مشکل تین چار آدمی اور ایک دو عورتیں ہی آسکتی ہیں۔ باقی مرد عورتیں بھی آتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ بھی تو یا تو نہیں رہتا، جینا، سامتھا، علی محمد اور جینا کی ماں یا کبھی کبھار انہی چند لوگوں کے لئے کش مکش کے واقعات ذہن میں آئے ہو جاتے ہیں مثلاً گڈیرا پلیٹ فارم پر پڑا ہوا، اور کئی کے لڑکھٹے ہوئے بچے جنہیں غلامیوں، واپار مینوں، سٹیشن والوں کے آوارہ چہرے کوئے اٹھا اٹھا کر بھاگ رہے ہوں اور ان کے گلے گلے چہرے میں سفید دانت بالکل اسی طرح دکھائی دیں جیسے اس نادیک سے ہر منظر میں

گرہن

ان کی ہنسی، ان کے قہقہے یادور کوئی پولیس مین اپنی ڈائری میں چند ضروری غیر ضروری تفصیل لکھ رہا ہو۔

پھر لات ماری
ایں؟ یہ نہیں ہو سکتا اچھا، پھر لات ماری۔

اور پھر۔

پھر ہسپتال کے سفید بسترے، کفن کی طرح منہ کھولے ہوئے چادریں،
قبروں کی طرح چادر پائیاں، عزت ایل نما زسین اور ڈاکٹر

رحمان نے دیکھا اس کی تند لوں والی چادر ہسپتال میں اس کے سر ہانے پڑی تھی۔
یہ بھی وہیں چھوڑ آئے ہوتے۔ رحمان نے کہا۔ اس کی مجھے کیا ضرورت ہے؟ اس کے
علاوہ رحمان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر اور نرس اس کے سر ہانے کھڑے ہر لحظہ لٹھے
کی سفید چادر کو منہ کی جانب کھسکا دیتے تھے رحمان کو قہقہے کی حاجت
محسوس ہوتی۔ نرس نے فوراً ایک چلچلی بید کے نیچے سر کاوی۔ رحمان قہقہے کرنے کے
لئے جھکا اور اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے جوتے پرستور جلدی سے چادر پائی کے
نیچے انا رویتے تھے اور جوتے پر جوتا چڑھ گیا تھا۔ رحمان ایک میلی سی بسکوی ہوتی
منہ ہی منہ اور بولا۔۔۔۔۔ ٹاک وارجی! مجھے سفر پہ جانا ہے، آپ دیکھتے ہیں میرا
جوتا بوتے پر کیسے چڑھ رہا ہے؟

ڈاکٹر جوا یا مسکرا دیا اور بولا۔ ہاں بابا، قونے بڑے لمبے سفر پہ جانا ہے،
بابا پھر رحمان کے سر ہانے کی چادر ٹھوٹے ہوئے بولا۔ لیکن تیرا
زاہد راہ کتنا ناکافی ہے بابا۔۔۔۔۔ یہی فقط سٹدل ادرا تاں لمبا سفر . . .

گرمی

..... بس جینا، جینا کی ماں، ساتھ اور علی محمد یا وہ فسون کا واقعہ.....
 رحمان نے نابھہ راہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ایک بڑے لمبے سفر پر
 روانہ ہو گیا۔

مکی

”۹۱۶“

”جی آں — ۱۶، تیسری قطار میں“ مکی نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو دباتے ہوئے کہا: ”آپ کو رحمت اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئے گی صاحب، کسٹل کٹر آپ کی مدد کرے گا۔“

”شکریہ اشکوریہ“ کہتے ہوئے نوجوان مسکرایا اور مسکراتے ہوئے اس نے ایک اور چوٹی کو نثر پر رکھ دی۔ چوٹی جیب میں ڈالتے ہوئے مکی نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی گاد داغ بہت تھک گیا ہو۔ وہ دن بھر کلتے کی ایک سیر کی گئی تھی۔ اور اس کو اس عظیم الشان سینما میں بیٹھ کر تھی۔ تھوڑی سی تنخواہ کے علاوہ کسی رنگین مزاج نوجوان کے لئے کسی لڑکی کے ہلو میں بیٹھ بک کر دینے کے موضوع سے چوٹی زیادہ متعلق تھی اور اس کی آمدنی پر ایک بڑا کنبہ چل رہا تھا۔ ایک بوڑھی، ہٹیلی بل تھی جو کتنا سلنے میں

ذرا سی دیر ہو جانے پر اپنا منہ آپ ہی نوچ لیتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی جسے اس کے خاوند نے بیوگی سے دو برس پہلے محض اس نے چھوڑ دیا تھا کہ اگلے جلانے سے پہلے وہ تمام گھر میں دھواں بھرتی تھی۔ اور پھر چھوٹے بھائی تھے اور بھانجے

کچھ دیر بعد مولے کی سی بیک رفتاری کے ساتھ ہی نوجوان کونڑ کی طرف آیا اور آتے ہی اس نے اپنی انگلیاں ٹکڑی کی کونڑ پر پکائی اور بولا "سیکن مام" — وہاں تو کوئی لڑکی نہیں؟

بکی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "کیس باہر ہوگی مام" اس نے مجھ سے ٹکٹ خریدا ہے۔ میں ڈرتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑے گا؟
 "اُف!" نوجوان نے بیزاری سے کہا "ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے مام" — مام! ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے؟

پھر وہ لڑکا کچھ دور جا کر ساگوان کے خوب صورت چوکھٹوں میں لگے ہوئے شلر کو دیکھنے لگا اور ایک اضطراب کے عالم میں اس نے آج شب کو، کے سرخ سیل بچاڑنے شروع کر دیے۔ پھر بکی کے پاس لوٹے ہوئے بولا "مائیسی سے تو انتظار اچھا ہے؟"
 بکی نے اس بے صبر نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور دل ہی دل میں اس کے خوب صورت بالوں کو مسرا بنے لگی۔ کتنے اچھے ہیں اس کے بال۔ دولت اور فکر میں گھرے ہوئے سیٹھوں کی طرح وہ گنہائیں۔ نہ ہی تو ندیا ہے اور نہ دھلا۔ بس ٹھیک ہے، اور اس کے بال دھان کے ان کھینٹوں کی طرح ہیں جنہوں نے مون مون ہواؤں سے پورا فائدہ اٹھایا ہو۔ اس کی وضع قطع اور باتوں سے شراب کی بو آتی ہے۔

گرفتن

حالاکہ شاید اس نے شراب نہیں پی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ جوان ہے۔ جیسے انور دیکھ جاتے ہیں تو ان سے شراب کی بو آنے لگتی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکا پر سے اٹھا کر، بڑے غور سے سینا کی چھت کا معائنہ کرنے لگا۔ چھت میں مصنوعی ستارے چمک رہے تھے۔ وہ بانٹا تھا کہ جب بنیا میں روشنی مل ہو جائیگی تو یہ ستارے اور زیادہ چمکنے لگیں گے اور بہت خوب صورت دکھائی دیں گے۔ چھت کی طرف نظریں اٹھانے سے آسمان کا رحو لا ہو گا اور وہ یقیناً اس منظر کو پسند کرے گا۔

اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو کہنے لگا — ستارے کتنے خوبصورت ہیں اور ...

... اور یہ سچ ہے۔ کہ اس نے تاؤں بھرے آسمان پر کبھی نگاہیں نہیں دوڑائی تھی۔ اور نہ قدرت کے اس کلکتہ کو جو کہ ہر روز رات کو آسمان پر دکھائی دیتا تھا۔ پسند کیا تھا۔ لیکن چھت پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تو وہ اس سے پسند کرتا تھا کہ ان پر پرجہ رخ کے ستاروں کا وحلو کا ہوتا تھا اور انسان ہمیشہ اہنیت کی نسبت اس کے صعو کے کو پسند کرتا ہے۔

پھر وہ نوجوان برآمدے میں ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ یہی کو قین تھا کہ وہ اس بے فکر سے نوجوان کو پسند نہیں کر سکتی البتہ بڑی ہی آسانی سے نفرت کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت رگمحل تھی اور شاید اسی لئے وہ اس کے متعلق اپنے خیال کو محبت کی آلودگی سے طمیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ وگرنہ اس کے لئے یہ کس قدر آسان تھا کہ شو کے شروع ہو جانے پر کنگ آفس کے سامنے ہاؤس فل، کال بورڈ لگا کر اس نوجوان کے ساتھ کسی سیٹ پر غور و جاہی مچتی۔

برآمدے کی دیوار پر بنایا پالش ہوا تھا اس لئے نوجوان کے کپڑے کسی قدر

گرہن

اکودہ ہو گئے لیکن پر سے ہٹ کو اس نے پھر اپنی اٹھکی سے دیوار کو تھپوٹا۔ گریا کپڑوں کے اکودہ ہو جاتے سے اسے دیوار کے نئے پالش کتے جانے کا یقین ہی نہ آتا ہو۔ پھر اس نے آدراہ ٹھکا ہوں سے سینما کی گھڑی کی طرف دیکھا بودا میں دیوار سے ہٹا کر مینجر کے کمرہ کے اوپر لگادی گئی تھی۔ اس نے گھڑی کو اپنی اصلی جگہ پر دیکھ کر پھر اسی جگہ کو دیکھا جہاں سے وہ اٹھالی گئی تھی۔ یہی سوچنے لگی۔ انسان کی عادت بھی عجیب ہے، وہ جانتا ہے کہ ایک چیز اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی گئی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں ایک بار پھر اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے وہ چیز اٹھالی گئی ہو۔ گویا اس کا ادراک اس تبدیلی کو یک ایک تبصروں میں نہیں کرتا اور شاید اس لئے اسے ۲۴ پرگنہ کے دیہات میں گزارے ہوئے زندگی کے دن بار بار یاد آتے تھے۔ وہ دن جبکہ وہ تہذیب سے دور دادا کے اں آرام و سکون کی زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن اب بلکلہ کے سے جذبات شہر کی زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔

بکلی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سیٹوں کے لمبن پر نظر دوڑانی شروع کی۔ آخر ایسے ہی بے مبرنوجوانوں کو کسی لڑکی کے ہلو میں جگہ دینے سے اسے ہوتی تھی۔ اس کی انٹل فکٹ میں خالی نشستوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ دورنوجوان کو کی کے ناخنوں پر لکھائی پالش چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ نوجوان گھور گھور کر اس جھپٹے ہوئے پالش کو دیکھنے لگا۔ جیسے اسے ان کے پالش ہونے میں یقین نہ آتا ہو اور وہ ان ناخنوں کو تھپو کر دیکھنا چاہتا ہو

چھبیس ستائیس تیس۔ جو مٹی قطار

بارد

مگر حق

— بکی کی نگاہیں ایک سیٹ پر جا رہیں۔ وہ شاید اس سیٹ پر نشان لگانا بھول گئی تھی۔ اس سیٹ کے لئے بھی تو ایک لڑکی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتی بھی تھی — مسز، مسوزا۔ خادیا اس کے ساتھ مسٹر، مسوزا انیس تھے وہ تھے یا نہیں تھے بکی ہلکی ہلکی سرور میں بالکل بھول چکی تھی۔ اسے توان کی شکل تک یاد نہ رہی تھی۔ بکی نے اپنے تھکے ہوئے داغ پر زور ڈالنا شروع کیا جسے اکڑا، اس جونی کو کوسنے لگی جو اسے اس کام کے لئے ملتی تھی۔

”جنگلیں“ بکی نے اس نوجوان کو بلاتے ہوئے کہا ”میں نے آپ کی سیٹ چھوئی تھی“ میں تیرہ پرکھی ہے اور بارہ پرکھی ہے مسوزا کی جگہ ہے اور بکی نے جان بوجھ کر سر کو مس کہا۔ آخر قدرت نے عورت کے اتنے پر تو ایسی تخصیص کا کوئی نشان نہیں رکھا اور پھر بکی کو اپنی بوائے عزیز ملی۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اپنی بہن پر اسے بہت ترس آتا تھا۔

. نوجوان نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا ”شکریہ“ اور ہال کے اندر داخل ہو گیا۔

بکی نے ایک سگریٹ سلگایا اور پچیلین کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ جب وہ پیش ٹیے کو اپنے نزدیک سرکار ہی تھی تو ایک بد صورت سا لڑکا آیا اور اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بکی غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ابھی کس تھا۔ اس کی سیس بیگ رہی تھیں اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ البتہ جانتا پتا تھا۔ ماں اور بہن کے علاوہ اس نے دنیا میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی۔ اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی شرم کے جیسے ایک شدید سا ڈور دکھائی دے رہا

گرمی

تھا جو کہ اس کے چہرے کے بعد سے نقوش کو اور بعد ابناء رہا تھا۔

لوہ کے سے ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ ایک اور چوٹی کی طرف سرگادی۔
 یکی کا منہ کھلا رہ گیا۔ تم چاہتے ہو۔ وہ بولی اور چوٹی کو ایک نظر سے دیکھنے
 ہوئے اس نے جیب میں رکھا اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے پلین پر جھک گئی۔ اس نے
 تھا صرف سولہ نمبر کی نشست خالی تھی۔ وہی نشست جو اس نے خوبصورت نوجوان کے
 لئے پہلے ہک کی تھی لیکن ساتھ کی سیٹ میں لوہ کی نہ ہونے سے خالی رہ گئی تھی۔ یکی
 نے سوچا اب وہ لوہ کی ضرورت ہیٹھی ہوگی۔ کتنی خوب صورت تھی وہ لوہ کی۔۔۔۔۔ وہ باندھا
 اور اس کے بالوں کے لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے دھان کے کھیت پر سے ہوا
 سرسرا رہی ہوئی گزر رہی ہو۔ شاید اس نے بال کسی نوجوان کی تو جو کہ کھینچنے
 کے لئے بنائے تھے۔ اس کے پلو میں اس بے دھن، بد صورت چھو کسے کو جگہ
 دینا اس لوہ کی تو بین کرنا تھا اور یہ چھو کر آواز ہی نہیں تھا بلکہ بالکل دیہاتی تھا۔
 ۴۴۔ پرگنہ کی طرف کار ہنسنے والا ہی تو دکھائی دیتا تھا اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا
 کہ نہ تو وہ چھت کے ستاروں کی تعریف سے سلسلہ کلام شروع کر سکتا ہے اور نہ ہی
 اس لوہ کی کے بالوں کو دھان کے کھیت کے شبیرہ سے ملتا ہے وہ گدھا تو جانی بتاؤں
 کو پسند کرتا تھا اور کہیں سے دھان کاٹنا اٹھ کر کلکتہ چلا آیا تھا۔

نوجوانوں کا ایک ٹولہ اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ لیکن نشستیں رک چکی تھیں چلن
 سارے کام راہ کی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے نشانوں کے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ
 کے اشارے سے سب کو بتا دیا کہ اب اس درجہ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ نوجوان
 اپنے اور روٹ تھا سے اور تینوں کے پانچپے اٹھاتے دس پے گئے۔

آسمان سے ننھی ننھی بوند باندی ہونے پر دنیا کے برآمدے پناہ گاہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد مون سون کے بڑے بڑے بارانی ریلے آنے لگے اور چند چھوٹیاں اپنے گون سنبا لیتی ہوئی دنیا کی ان کھڑکی کی طرف آنکھڑی ہوئیں۔ ان لڑکیوں کے ریلے دروازے کی طرف دھکیل دیئے جاتے تھے اور ان بارانی ریلوں سے وہ ریلے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت بچی کے دل میں اس وہابی نوجوان کے لئے ایک عجیب، مایوس جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنے کمرے کے سامنے ہاؤس فل، کائنات کا دیا اور خود کھڑکی بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی، اس چھوٹے کمرے کے کپڑے ہونے بہتوں میں ٹکٹ سے دیا اور پھر خود اسے کند کڑ ٹک لے گئی مسلسل کاپتے رہنے سے اس چھوٹے کمرے کی بد صورتی کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کند کڑ نے احتیاط سے اس نوجوان کو سولہ نمبر کی نشست پر بٹھا دیا۔ بچی دروازے میں کھڑی اس چھوٹے کمرے اور اس کی زندگی کی طرف دیکھتی رہی بلاتلے گھبرا کر اپنے دائیں طرف دیکھا اور مضبوطی سے اپنی کرسی کی سلاخوں کو پکڑ لیا۔ اس لڑکی کو اپنی شام کے تباہ ہو جانے میں کوئی شک نہ رہا۔ بچی نے سر ہاتھ دہ لڑکی بھی میری طرح ربط حسن کی بجائے اپنی چوٹی یا اس کے نوٹ کو بند کرتی ہو۔ اس کے بعد پرستے چھٹ گئے اور دنیا شروع ہوا۔ انگریزی فلم ————— حیرانم عجوبے پہلے سفر کرتا ہے "شروع ہوئی اور گانا ایک دلنشین ٹون پر گایا جانے لگا۔

نارولی بھری رات کے نیچے

بچی نے ایک گہرا، ٹھنڈا سانس لیا اور اپنے دل میں ٹھون کر گنگنا لے لگی۔ تاروں بھری رات کے نیچے، لیکن ابھی وہ سکرشور کالین بنا تھا اور اسے تین ماہ سے تین

روپے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اب تو وہ بہت ہی تھکا گئی تھی۔ اپنی آنکھوں کو شدت کی روشنی سے جلانے کے لئے اسے بال کا اندھیرا پسند تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ تاروں بھری رات کے نیچے کا دلغریب گمان اس کو اس بد صورت نوجوان کو کیا خوب صورت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان یاد آئے گا یا بال کی صحت؟ یا خوب صورت نشستیں جہاں ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے؟ اس کے بعد کی باہر نکل آئی۔ کند کڑ جانا تھا۔ کہہ کی، اسی جگہ کھڑی ہو کر لمحہ دو لمحہ کے لئے کچھ دیکھا کرتی ہے اور پھر فوراً ہی مضطرب ہو کر باہر نکل جاتی ہے۔ گویا پردہ سمیں پر کوئی بہت ہی خوفناک منظر دکھایا جا رہا ہو۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ وہ سکون سے ایک گمان بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دل کا برتن چھوٹا ہے اور موسیقی کا ظرف بہت بڑا اور نغمہ اس کے چھوٹے سے دل میں نہیں سما سکتا۔ وہ اپنا جھپٹتا ہوا دل سے کہ باہر نکل آئی اور تاروں بھری رات کے نیچے ۲۴ پرگنہ کے کسی گاؤں کے تالاب کا کنارہ اسے یاد آ جاتا جہاں اس کی محبت پر دان چڑھیں اور لٹ گئی۔ جہاں بے ہند و عورتیں اپنا گھڑا بھر کر چلی آتی تھیں۔ اس سے زیادہ جگہ ان کے حلقوں میں نہ تھی۔ اور اس شے کے پانی سے وہ کھانا بھی بناتی تھیں اور چوکا بھی کرتیں۔ گھٹے کے گوہر کو مٹی میں ملا کر وہ چوکے کو بڑی معنائی سے پوتا کرتیں اور کئی کاجی بھی پاتا تھا کہ ان بڑے بڑے شاندار ہرٹوں کو چھوڑ کر کسی ایسے غلیحہ کرنے میں صبر و سکون سے پڑ رہے اور ان ہی عورتوں کی طرح چار پائی پر لیٹ کر رات کو تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا تماشا دیکھا کر رہے۔

وہ منجر کے کمرے کے پاس کھڑی ہو کر سگریٹ سلانے لگی، کچھ دیر بعد بال میں روشنی ہو گئی۔ ہاٹ اٹھ ہو چکا تھا۔ کئی نے پھر ایک دفعہ پردوں کے پیچھے سے سولہ اور

اس کے ساتھ نشست کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لئے ویسے ہی اجنبی تھے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر بیٹھے تھے۔ اگر وہ چھو کر اظہار دیتے تھے اس خوب صورت ٹیون کی تعریف کر دیتا تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ لیکن وہ تو گم سم مٹا تھا۔ اس بات ظاہر میں وہ کوئی بات شروع کر سکتا تھا۔ لیکن وہ باہر چلا آیا۔ اس کا چہرہ بہت اتر ہوا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکتا تھا۔ اور اپنے لبوں پر بے تحاشہ زبان پھیرتا اور ان سب حرکتوں سے وہ بالکل ایک اجڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

”ہلوس — نام“ اس نے باہر نکل کر دوڑتے ہوئے کہا۔
 کی نے سکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بولی ہو — — بواتے، انجائیڈ
 آرائیٹ (کو، خوب طفت رہا تا؟)

اس لڑکے نے ٹوٹی چھوٹی انگریزی میں برابر دیا ”نام“ — میں تو کھلتے
 دیکھنا چاہتا ہوں اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اس کے بعد وہ ہلانے لگا۔ میرا چچا
 کراؤ لہ میں دکان کرتا ہے۔۔۔۔۔

کی کا جی چاہا کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتی ہوئی کہہ دے کہ کھلتے بالکل اس ہال کی
 چھت کا سا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے چھت کو بغور دیکھا بھی نہیں تھا۔ اور کی بھی
 یک لخت پریشان اور اداس ہو گئی۔ اس کے سر میں زیادہ درد ہونے لگا۔ وہ ہی دیہاتی
 نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ بہت رحم دل تھی۔ اس کے بعد جب مٹو ختم ہوا تو کی نے
 منجر سے چھٹی لے لی۔ اس وقت وہ دیہاتی، بد صورت نوجوان باہر آیا۔ کی اس کے
 قریب چلی گئی — بولی۔

”ہو برائے — تم کہاں کا رہنے والا ہے؟“

گھر میں

”ہریش پور — ۲۴ پرگنہ کا“

”میں جانتی ہوں ہریش پور — میں ایک دفعہ سڑے کے ہاں ایک ماہ
کھڑی تھی“

”رے؟ ہاں ہاں“ لڑکے کا چہرہ ہلکا اٹھا ”میں رے کو جانتا ہوں وہ ہمیں
بڑھاتے رہے ہیں“

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ لڑکا بولا ”آپ اتنی حیران ہیں —
کیا میں آپ کو ہم جان سکتا ہوں؟“

”غنی“ کی بولی ”لیکن یہاں سب لوگ مجھے مارگریٹ کہتے ہیں۔ سڑے کا بڑا
بھائی میرا آپ تھا۔ اسے سرے ہونے دس برس ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ایک اینگلو
انڈین لڑکی سے شادی کی۔ وہ لڑکی میری ماں ہے۔ اور کیا تم کلکتہ
وکیٹنا چاہتا ہے؟“

چھوڑ کر رے نے سر ہلادیا۔ مارگریٹ بولی ”جلو ہم کافی کی ایک پیالی پیئیں گے“
اور وہ دونوں فرلو، کی طرف چل دیئے۔ ہوٹل کے دروازے پر دوڑے پڑے
دردیہا لب و درے چاند کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ مارگریٹ نے ان کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا — ”دور سے اہلی چاند کا دھوکا ہوتا ہے“ نوجوان نے
فدا ہاں میں ہاں ملا دی۔ مارگریٹ ان لمبوں کی طرف اشارہ کر کے کھنچا ہوا ہنسی۔ بس
کلکتہ ایسا ہی ہے۔

پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے اور کافی پیئے گئے۔ اس نوجوان کے سرے سے
صاف ظاہر تھا کہ اسے کافی کا تلخ ذائقہ پسند نہیں۔ وہ گنوار شاید دو کے ٹکے چڑھا

جانا تھا۔ کافی کے بعد مارگریٹ نے کئی چیزوں کا آرڈر دیا۔ روٹ کے کوان میں سے کئی چیزوں کے نام نہ گنتے۔ مارگریٹ پوچھتی۔

”یہ کیا ہے؟“

”معلوم“

”سایج — کو سایج“

”سایج“

”یہ کیا ہے؟“

”معلوم“

”کٹش — کو کٹش“

”کٹش“

کبھی وہ لڑکا معمولاً انداز سے کچھ ارکھ دیتا تو مارگریٹ اسے درست کرتی۔ جیسے بچپن میں ماں بچے کو نئے نئے ہم لینے سکھاتی ہے۔ اور جب وہ الٹا سیدھا نام لیتا ہے۔ تو اسے درست کرتی ہے۔ لانی پینے اور کچھ کھا کھنے کے بعد مارگریٹ نے پیسے نکالنے کے لئے سیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن اس روٹ کے نے تمام لیا اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر ہل پر رکھ دیتے۔ مارگریٹ کا خیال تھا کہ لکھتے میں عورت لابل ادا کرنے کا اخلاق اس نوجوان کو نہ آنا ہو گا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ وہ اس بات سے تردد آف تھا۔ ایسے ہی جیسے سینا میں چوٹی زیادہ سے عورت کے ساتھ عدیٹ بک کرالینے کا طریقہ اسے کسی نے بتا دیا تھا۔ اسی طرح عورت کے ساتھ کافی پی کر اکھا نا کھا کر اس کے پیسے ادا کرنے کا اخلاق بھی کسی نے سکھا دیا ہو گا۔

مارگریٹ نے بتایا۔۔۔ کلکتہ بہت مہذب ہو چکا ہے اور تہذیب بھی انگوٹھ کے وانوں کی طرح ہے جب یہ بہت پاک جاتی ہے تو اس سے شراب کی بو آنے لگتی ہے اور جب ارگریٹ کو پتہ چلا کہ دور کا عورت کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتا۔ تو اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑنے ہوئے کہا:

”بوائے، کیا تم آج شب میرے مہمان ہو گے؟۔۔۔۔۔ میں آج اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ یہاں گھر سے علیحدہ میرے پاس ایک بہت اچھا فلیٹ ہے۔۔۔۔۔ میں تمہیں بتا دوں گی عورت کیا چیز ہے۔ لیکن وہ عورت جس نے تمہیں سینما کے دروازے پر بلایا۔ یا جسے تم نے ۲۴ پرگنہ میں دیکھا۔ یہاں تم اسے نہیں پاسکو گے۔۔۔۔۔ ہاں تم اس عورت کو دیکھ لو گے، وہ عورت جو کلکتہ ہے!“

اغوا

”آلی آلی“ دلاور سنگھ نے زور سے پکارا۔

آلی — علی جو ہمارے ٹھیکے لاکشمیری مزدور تھا۔ منشی دلاور سنگھ کی آواز سن کر علی جو ایک پہل کے لئے رکا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ابھی تک لمبوں کی طرح ترش تھیں اور علی جو کی سرخ رگوں سے بھری ہوئی آنکھوں نے انہیں چکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ منشی جی کی طرف آنکھ دٹھائے بغیر علی جو نے نل کارسہ تمام کو بقیہ چرخہ کو گھومنے سے روک دیا اور جوا بابلند آواز سے بولا — ”ہو سردار!“

سردار خاموشی اور کم گو آدمی تھا۔ آج اس کا خلیفہ معمول اونچی، پرجوش آواز سے پکارنے کا مطلب یہ تھا کہ کھنسا اپنے آبائی گاؤں، جہڑیالہ گوردہ سے واپس آگئی ہے۔ دھماکے پر کام بدھ اور جمعرات کو کس لئے بھی سست رہا کہ کھنسا کے صاحب

[illegible]

یہ شیخ جی ساٹھ کے تھے۔ لیکن تھے بڑے کایاں۔ انہیں زلف پہ شب و بجر کی بھٹی سو جھا کوئی تھی۔ وندگی کو تشیح جی نے بس بی لیا تھا۔ لیکن بقول ولا ورنکہ ابھی ”بٹھوٹھا“ ہاتھ میں تھا۔ یعنی تھے کاسہ بدست۔ کئی مکمل اور نامکمل رومان ان کے ذہن کی انٹریوں میں تب محرقہ پیدا کر رہے تھے۔ شیخ جی علوان بات یوں شروع کرتے ”جب ہم جوان تھے“

اس کے بعد شیخ جی کی شنوائی نہ ہوتی۔ ہر ایک اپنی جوانی میں صحت تھا۔ کم و بیش ہر ایک کی جوانی شیخ جی کی رعیت پسند جوانی سے زیادہ روٹھیں تھی اور اسے اس پر کجا بابے جالود پر ناز تھا۔ چنانچہ جب ہم جہان تھے ۴۰۰۰ کے ساتھ

ہی ایک ہڑسامع جاتا۔۔۔۔۔

کبھی شیخ جی بھی جوان تھے؟

پرانی ہو گئی اس شیخ جی کی جوانی۔۔۔۔۔

اوبے، بکتا کیوں اسے۔۔۔۔۔ اسے سپ روبرے ایمان گئی!

..... اور برب آوے گدی پر جوانی.....

قد قہ !!!

کنسو کو کبھی شیخ جی سے بے حد عقیدت تھی۔ دراصل کنسو کو ٹیکے کے ہر آوجی سے انس تھا۔ وہ ایک پھر کی طرح گھومتی ہوئی آتی اور کاریگروں، مزدوروں کے اس ہڑ میں گھومتی پھرتی، فقر سے حسرت کرتی نکل جاتی۔ بڑی ہی جان تھی اس پھر کی، اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہت ہی طاقتور اور اتھ کی چٹکی نے اسے گھما کر وقت اور صفت کی دستوں میں بیٹھا، ہمیشہ آوارہ رہنے کے لئے سمجھوڑ دیا ہے اور یہ پھر کی اسی گت سے رہتی دنیا تک گھومتی رہے گی اور کبھی دم نہ لے گی۔۔۔۔۔ آپ ابھی کنسو سے باتیں کر رہے ہیں اور اسے شرم کے اپنی غلی جو آنکھیں کنسو کے چہرے پر نہیں گاڑ سکتے۔ آپ اسے لمانچے سے ماگو ان یاد یودار میں سوراخ کتے جاتے ہیں اور پھونکیں مار مار کر براد سے کوڑے اڑاتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا جی پامتا ہے کہ ایک نعل، ایک چھین اپنے حسین مخاطب کو دیکھ لیں۔ آپ ذرا گردن پھیرتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ کنسو فاقب ہے۔۔۔۔۔ فاقب! ہمارے ایک پہلی ہے۔۔۔۔۔ یہ تھی! وہ گئی۔ اس کا صل بے شکا، اور ظاہر بے شکا کتنی تیز اور دور رس ہوتی ہے۔ جو بدل وجود کو بھی حیر جاتی ہے۔ اور جس سے آپ اپنا آپ بھی نہیں چھپا سکتے۔ ابھی وہ

گروہن

یہاں برے کمائے اور ساگوانی براہے میں الجھی ہوئی ہے اور اگلے ہی لمحے وہ اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں زمین اور آسمان ملتے دکھائی دیتے ہیں اور جہاں درختوں کے زمردین طاؤس اس طاہ کی خوشی میں پاگل ڈالے اپنے بھد سے اور کرسہ پاؤں زمین کی گولائیوں میں چھپاتے تا پتے نظر آتے ہیں۔ جہاں آپ کا جسم بھی جانا چاہتا ہے۔ لیکن جہاں ملکتا کیونکہ جہاں سلطان خلوت کرتا ہے وہاں چشم نامحرم ہوتا ہے جس جگہ جان پہنچتی ہے وہاں تن باریاب نہیں ہوتا۔ کاریگر دل کی سیلی کنسو بھی ایک پسلی تھی۔ پاک سمجھنے میں وہ اپنے خلوت خانوں میں گم ہو جاتی اور گنتی دل، علیا، علی جو اور ہما، اسی سال کا لالہ شکر منہ اٹھا کر وکھتا رہتا۔ اگرچہ رائے صاحب نے اسے بہت آزادی دے رکھی تھی۔ پھر بھی وہ اپنی اس لاڈلی ڈیر تھی، وہ گئی، سے بہت، بہت نالاں تھے۔

ان دنوں ماڈل ٹاؤن بنایا آباد ہوا تھا۔ قلعے یک کچے تھے لیکن تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہر خریدار میں پہلے تم کو وہ کا جذبہ تھا اور رائے صاحب نے پہل کی تھی۔ زیر تعمیر بننے کے ساتھ اس بلاک میں صرف ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی۔ جس میں رائے صاحب شہر سے اٹھ آئے تھے۔ کھلی آب و ہوا میں رہنے کا خیال آتے ہی رائے صاحب کا شہر میں تعین سے دم ٹھٹھنے لگا اور وہ اس کوٹھی میں پوجا کو بڑی بے سبوری سے بیٹھنے میں پکڑ لیا۔ انتظار کر رہے تھے جبکہ کے لئے شہر کے رڈ سا کی ایک سی چوڑی فہرست میں ہر روز ترمیم ہوتی تھیں۔ ان دنوں کو بربا جان میں بھر خیال آیا تھا اور رائے صاحب اس کی خبریں پڑھنے سے بہت گمراہ تھے۔ بس اسی کوٹھی کے سوا اور نہ کوئی مکان نہ تھا۔ کئی ایک ایکڑ زمین میں لوہک بوئی اگ رہی تھی۔ مجھ سے ان کی مجرد ٹھیکے پر ہی سو جاتے تھے۔ شیخ جی بھی دیہی سویا کرتے ان کی بیوی

وفات پاگئی تھی شیخ اور شیخانی کی زندگی بھر نہیں بنی۔ کیونکہ شیخ جی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ شیخانی میری گردن کے نیچے بازو رکھ کر سوا کرتی تھی اور میں نے اس کی گردن کے نیچے کبھی بازو نہیں رکھا تھا۔ اور پھر کنسو کو شیخانی کی وفاداری کے قصے سنایا کرتے تھے۔ کنسو ہر ایک کی دکھتی رگ سے واقف تھی۔ شیخ جی سے باتیں کرتی تو بے چاری شیخانی کے متعلق۔ مجھ سے بات کرتی تو میری شادی کی ناممکن ممکنات پر اور میری بوائی بیوی کی شکل کے متعلق۔ جسے وہ بھال کر کہہ کر میرے دل میں ہمیشہ ایک گدگدی پیدا کروا کرتی اور علی پور سے بات کرتی تو کشمیر کے رومانی مناظر اور فزوں کی تجارت کے متعلق۔ علی پور جو حقیقت سرور نہیں تھا۔ لیکن نامساعد حالات اور فزوں کی تجارت کی تباہی نے اسے اس کام کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ اب بھی جب کبھی بارش کے بعد فضا کے حنا کی ذرات وصل جاتے تو اسے ماٹل ٹارن میں پہاڑ دکھائی دیتے گتے۔ . . . اور کنسو جانتی تھی کہ ہر ایک کا چور و دروازہ ہوتا ہے اور وہ اس چور و دروازے سے بلا کسی آہٹ کے اندر داخل ہو جاتی اور اندر سے سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے آتی ہم نین چار لوگوں کے سوا ڈیڑھ میں تین چار پور ہیں، انہیں دیکھتے جو اپنی لگائیں کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ انہوں نے عارضی طور پر بیٹوں کی کئی بے ترتیب کرٹھیاں بنا ڈالی تھیں۔ اور ماٹل ٹارن کے اندر ایک اور ماٹل ٹارن آباد کر دیا تھا۔ بلا کی عورتیں تھیں۔ ان کی لگائیں۔ کڑا لکے کی سروی میں صرف ایک انگلیا یا ایک معمولی سی صدری پہن لیتی تھیں اور چالیس چالیس کمب فٹ روٹی کٹ ڈالتیں۔ ان کا دودھ بچے پیتے تھے۔ بوٹیکیدار پیتا تھا اور ٹھیاں خاندان چھوڑتے تھے۔

بھلا بوٹیکیدار کاجس نے نہیں ساگواری براہ تک جھانسنے کی اجازت سے رکھی تھی۔

گروں

اگرچہ آگ ان دنوں ایم کے بعد کبھی تھی بمنزئہ سردار گھیلارائے جی، پالا
پوک نہ پالا ناگہ — پالا ٹھنڈی داسے جی — یہ کہادت میں شیخ جی سنایا
کرتے تھے جس کا مطلب تھا کہ ٹھنڈک صرف ہوا سے پیدا ہوتی ہے۔ کہیں دور چٹانک
چٹانک کے اوپر سے تھے شیخ جی نے حجامت کے لئے شہر جانا طوسی کرویا
اور لگے ابر آور آسمان کی طرف تکتے اور سر پر ہاتھ پھیر کر، اللہ خیر کا وظیفہ پڑھنے،
کوٹھی میں داسے صاحب کی بڑی بھینس نے ناند کے ساتھ جسم رگڑ کر جھول گراوی تھی۔
شیخ جی جھول کو اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ ہمارے پاس آئے۔ آج انہوں نے
ایک نئی چیز دریافت کر لی تھی اور وہ یہ کہ لاہور میں رہنے والے لوگ لاہور ہی میں
لوگوں کو چٹیاں ڈالتے ہیں۔ کتنا بڑا شہر ہے لاہور شیخ جی کی اس دریافت
پر مجھے بہت ہنسی آئی لیکن میں بستر و حساب کتاب میں منہمک رہا اور شیخ جی کی پیمہتی
کے متعلق سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد شیخ جی وٹھتے ہوئے براہے کے قریب آگئے اور
کچھوسے کی طرح جھول میں سے گروں نکال کر بولے

”کنسو بہت ہی جوان ہو گئی ہے“

اب یہ بات بھی لاہور کے ایک بڑا شہر ہونے کی طرح ایک دریافت تھی۔
لیکن کنسو کا نام سنتے ہی علی بو، رحمان بو، اور گئی دتی کے کان کھڑے ہو گئے۔ دراصل
لاہور کی تمید اسی ہم کے گولے کے لئے تھی۔ لیکن تمید اور حرف مطلب میں اتنی بے تعلقی
تھی کہ لاہور کی چٹھیوں کے بعد بے وقوف طبقہ کے سب آدمی اسے ضمنی بات سمجھ
سکتے تھے۔

میں چاندیوں کو اکٹھے ہوتے دیکھ کر لاریوں نے بھی اڈوں پر دم لیا

کرمیت

اور ادھر چلے آئے۔ ولاور سنگھ نے پھر نل پید ملانے کے لئے دودھ سے پکارا۔
 ”آلی۔۔۔۔۔ آلی۔۔۔۔۔“ آلی۔۔۔۔۔ ”اوس کے بعد خشت و دہرہ اول کی مسم
 پریشیاں اٹھائے شیخ جی کو طرزیہ سلام جگمانے خود بھی ادھر چلا آیا۔ جمیلار رام آسرت نے
 بھی زندگی بھر نہ ٹوٹنے والے میکا نیری جوتے سر کائے اور قریب آگیا۔ علی جوتے اپنے
 کساد ہاتھ پاؤں پھیل کر گدھ کی طرح ایک لمبی اور بے ڈھنگی سی تلا پنج بھری اور گئی کہ
 اپنے جوتوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ گئی بولا۔ پرے ہیٹ ہاتھ۔ علی جو لفظ ہاتھ سے بہت جلتا
 تھا۔ کیونکہ ٹھیک پہنائی اصطلاح میں ہاتھ تو بوجھ اٹھانے والے کشمیری کو کہا جاتا ہے۔
 اور علی جو کوئی لڑو دھانور تھوڑے ہی تھا۔ علی جو نہ تو مزدور تھا اور نہ ہی مالک۔ وہ تو
 خوب صورت لفظوں میں لکھا ہوا ایک المیہ ڈرانا تھا جو فروں کی تباہی پر ختم ہوتا تھا۔
 علی جو کا جسم ترکستانیوں کی طرح سڈول اور تنومند تھا۔ ادھر پنجاب میں مختلف کام کر کے
 اس نے اپنے پیسے جمع کر لئے تھے اور اب وہ بارہ مولا پنج کر اپنی زندگی کا مفید عیش
 حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علی جو نے گئی کو ٹھنی دی۔ مارنے والے سے مارا، کھنے والے سے کھ لیا۔ بات
 جاری رہی جو مارنے اور کھنے سے زیادہ دلچسپ تھی۔ ولاور سنگھ بولا:

”وہد ماکش ہے سالی“

علیا بولا ”گجب خدا کا اسے روکتا بھی کوئی نہیں۔ کئی دفعہ تو بڑی ہی دیر سے گھر
 آتی ہے۔ جب ہم شام کو گھر جلتے ہیں۔ تو اس کا تانگہ ہمیں نہر پہ ملتا ہے“
 ”خبر نہیں کہنے بار رکھے دے ہیں اس چھو کر ی نے“
 ”مجھے تو بھائی دیکھے“

”کس کے ساتھ دیکھے بیائنتی؟“

”جو بھی کوئی لے جاتے — جوانی آفت پہ آتی دی ہے“

اور سب نے مشترکہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ کنسو بھاگ جانا چاہتی ہے سب اپنا اپنا تھوڑا چمکانے لگے شیخ جی نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولے ”تم سب گلط کہتے ہو۔ وہ نہیں بھاگے گی۔ کم سے کم میرا تو سوبوسے، یہی کھیاں ہے!“

کنسو کے طور اظہار سے تو مجھے بھی یہی شک ہوتا تھا کہ وہ حلین کی اچھی نہیں اور اسے کوئی بھی بھگوان کو لے جاسکتا ہے۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو شیخ؟ میں نے مسما سوال کیا۔

”کم سے کم ان رنوں تو اس کی باتوں سے مجھے کوئی شک نہیں ہوتا“

”کیسے؟“

”جانتا ہوں — بس کہ جو دیا شیخ نے سر ہلاتے ہوئے ایک بے معنی مساجوب دیا۔ سوچ کی شاعری اس وقت ہنس خنہیں کی سی تھاس پیدا ہو گئی تھی اور علی جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیخ جی کے منہ کی طرف دیکھ سکتا تھا اور سوچ سکتا تھا۔ اتنی بھی کیا ٹھنڈک لگ رہی ہے شیخ کو، بسا اٹھینس کی سی قبول سپیٹ پلا آیا۔ گئی اس وقت کچھ تو دل لاشکاری معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس کا جی چاہتا تھا کہ قبول میں سے نکلی جوئی گروں کو پکڑ کر روڑے۔ کنسو پچھوڑے ہی بھاگ پائی تھی۔ ذرا ایسی باتوں سے مزاحی لے لیتے۔ شیخ جی کی اس بے دلیل قطعیت — بس کہ جو دیا پر مجھے بھی غصہ آ رہا تھا۔

کائیں، کائیں، کائیں۔ آسمان کے آخری گوشے سے چھانکے انگے کے جنگل کی طروت جا رہے تھے اور اپنے پیچھے آوازوں کی غیر مرنی لکیریں چھوڑتے جاتے تھے۔

”یہ بابو“ سمجھا اور رام آسمان کی بیوی رام رن نے آواز دی اور حبیب رام آسمان سے

نہلا توڑ کر رکھڑوں میں رکھ کر سر کے اتار کو اس میں پھینک دیا اور آپ کو کھٹے ٹکائی ہوئی اپنے ماڈل ٹائون کی طرف چلا گئی۔ ولادیسلمک شست درجہ اول کی پریوں کو سرے تحت پیش کے صندوقچے میں بند کر کے تالا لگاتے ہوئے بولا: "آج شیخ جی نے سہری تریاں (جنگ) پلائی ہیں۔"

"بنکارے بے بڑھاتو" پوچھا بولا۔

عجیب بات تھی سب کسمو کا بھاگ جانا پسند کرتے تھے۔ میں نے مزدوروں کی ولایت کو تے ہوئے کہا: "بابا! اماں! اماں کی اتنی بے پروائی رنگ تو لائے گی ہی یہ جتنی کھل کھیلنے والی چھو کر مایں ہوتی ہیں یہ سب بد معاش ہوتی ہیں" لیکن اندر ہی اندر شیخ جی کے تجربے کا تامل تھا۔ عمو! بڑھے لوگ لڑکیوں کو آزاد و کچھ کر اس قسم کے فتوے صادر کرتے ہیں لیکن یہ بڑھا اس کے برعکس باتیں کر رہا تھا اور پھر اس نے اتنی قلعیت سے اعلان کیا۔ آخر جب ولاد نے مجبور کیا تو شیخ شروع ہوا: "دیکھو سردار جب ہم جوان... کائیں، کائیں، کائیں۔۔۔۔۔ زمین کے آخری کوٹوں نے شور مچا دیا اور گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سبز رنگہ ترکان نے اوزار بوری میں ڈالے اور ہو ہو ہو کتار ام آسرے پر گر پڑا۔ ام آسرے کی پیاس گڑبسی چڑھی کھل کر کھلے میں جا پڑی۔ اس نے ترکان کی چڑھی اچھاں دی۔ سردار کا جو بڑا کھل کر ہوا میں لہرانے لگا۔۔۔۔۔ چلو گھر چلیں شیخ پھر سے جوان ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ راستہ چھوڑ دو ورنہ زخمی ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔ آلی۔۔۔۔۔ آلی۔۔۔۔۔ ملی چوکی بے آواز منہ سے مرنے لگی۔۔۔۔۔ فتنی کی آواز نہی آئی۔ اوئے نہیں پڑیں گے شیخ جی۔ بنارسک حیات بنو ایس۔۔۔۔۔ کوئی بولا اور سب اپنے اپنے چھانٹے مانگے کر پوچھا رہے۔

گرمی

اس وقت اندھیرا میدان اوڑ لو تک بوٹی پر نینگ رہا تھا۔ دودا ایروڈ رام میں ایک ہوائی جہاز اتر آیا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی دم کا چمکتا ہوا نقطہ ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح تیزی سے زمین کی طرف آ رہا تھا۔ اس ٹوٹے ہوئے ستارے کو دیکھ کر اندھنی ماڈل ٹاؤن سے رام دتی یا اس کی کوئی بہن بولی..... رام دہم..... رام دہم..... میں سوچنے لگا۔ آج مجھے شب بھر نیند نہیں آئے گی۔ باتوں باتوں میں ان سالوں نے آج کیا پٹاخہ چھوڑ دیا۔ کیا کنسو کی شکل اس کی ہوائی جہاز کی شکل سے تو نہیں ملتی؟ اور میری رگوں میں خون کا دورہ تیز ہو گیا۔ میں نے کہا اب میں متاثر دودھ نہیں پیا کروں گا۔ اس سے میرے جسم میں بہت ہی جان آ جاتی ہے۔ پھر مجھے نہی آنے لگی ہی ہی ہی..... صبح اٹھ کر میں نے پاجامہ بدلایا۔ بہت گندہ ہو چکا تھا پاجامہ اور قمیص بھی میل ہو رہی تھی۔ ابھی مشکل دس ہی بجے ہوں گے کہ کنسو پھر گھومتی پھرتی آئی اور شیخ جی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی پاکیزگی کی طرح سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن میں نے سوچا کہ ان کپڑوں کے اندر سفیدی کی بجائے سرخی ہے۔ گرم گرم لہو کی سرخی۔ کنسو کے بالوں اور درپٹے کی متوازی لکیریں اپنی چمکتی ہوئی سیاہیوں اور سفیدوں کے ساتھ بے پروایانہ انداز سے پشت کی پلک ڈنڈیوں اور شاہراہوں پر رواں دواں تھیں۔ شیخ جی نے پوچھا: ”سنڈیا لے سے کب آئیں تھیں تم، بیٹی؟“

”کل جی تو آئی تھی بابا.....“ کنسو بولی ”سنڈیا لے میں میرا چچا مر گیا تھا بابا۔“

بات سنوں تھیں اس چچا کی؟ پچا روٹیشن ماسٹر تھا۔

شیخ جی نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ”میرا دانا روٹیشن ماسٹر ہے۔“

کنسو نے میری طرف دیکھا۔ شیخ جی کے خلاف میری اور کنسو کی سازش تھی۔ میں

نے مکرراتے ہوئے کہا۔ چونے کی کھڑی گاڑیاں — بہتر روپے اٹھانے
 ”کنو نے کہا۔“ میری بات کو سنو بابا“

بابا سنتے لگا۔ ”ساری عمر لاہور میں رہا بیچارہ۔ وہیں بالوں اسکولوں میں
 لڑکے پڑھتے تھے۔ دو برس ہوئے تھے چھ مہینے شیخانی کی طرح لیکن وہ بچوں کے ساتھ
 دل بہلا لیتے تھے۔ اس کے بعد تبدیلی ہو گئی شور کوٹ روڈ۔ وہاں کو لڑکوں کو اتنا پڑا
 کہ چار کنبے رہ جائیں۔ رات کو مکان بھابھیں بھابھیں کرتا۔ اس میں چاہا کیلے ہانگیں پڑے
 پڑے رہتے۔ لیکن وہ زندگی بھر کیلے نہ رہے تھے۔ پڑے لڑکے کی شادی کے بعد
 ہو کر رونق کے لئے گئے۔ بھابی کو شور کوٹ والوں نے سر پر اٹھایا —
 پڑے بابو کی ہوا پڑے بابو کی ہوا — ہو کو آئے مہینہ بھر دہرا پایا تھا کہ بیٹے
 صاحب آ سکیے — اب ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور پھر تم جانتے ہو روٹی
 کی کتنی تکلیف ہو جاتی ہے۔ ہو بھی اتا ولی سی تھی۔ ٹمک وغیرہ اٹھا چل گئی۔ بچا بہت
 روئے بہت روئے بنط میں لگتے ہیں بیٹے کو — ہو کے آجانے
 سے مجھے تمہاری ماں کے ون معلوم ہونے لگے تھے۔ وہی رونق ادھی لیکن
 لیکن تمہارے ماں تو کوئی میٹا بھی نہیں ہے جس کی ہو تم بے آؤ“

رخ جی بولے ”میٹا ! میں بھی زندگی بھر کیلا نہیں رہا۔ اب یہاں ٹھیکے
 پر ٹانگیں پڑ کر سوتا ہوں تو ساری دنیا سائیں بھابھیں کوئی نظر آتی ہے۔ شیخانی
 کے دم سے بڑی رونق تھی۔ وہ یوں غریب تھی لیکن نیت کی بہت امیر تھی شیخانی —
 یہ کون ہے — یہ واناو آ رہا ہے؟ یہ کون ہے اس کے چھیرے بھائی کی
 بی بی ہے، یہ کون ہے وچالی کی بیوہ ہے ابھی چائے بن رہی ہے

نل پندرہ فٹ کے قریب زمین میں جا چکا تھا۔ دلاور بولا ”ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔ زمین کچھ پتھریلی ہے۔ کڑھت محنت سے ٹوٹے گا“

زمین کے اندر سے بہت سے چھوٹے چھوٹے سفید پتھر باہر آ رہے تھے علی بڑے سے کوکھینتا تو اس کے پٹھے تن جاتے تھے۔ کمنو بہت دلچسپی سے ان کی باتیں سنستی رہی اور علی جو کے تو متحکم کو دکھتی رہی۔ علی جو اس وقت سورج کی پہلی کرنوں میں تھما رہا تھا۔ فزائیدہ بچے کی طرح وہ سر سے ہاڑں تک خون کا ایک بڑا سا قطرہ دکھائی دیتا تھا۔ ٹپ کی باہر اس کے باؤں کی سٹرخ، گنگنیر یاں اڈن کے کنارے نہری ہو رہے تھے۔ چھاتی پر اڑے ہوئے چھتر دلوں میں سے اس کا نصف، تباہو اسینہ و عورت فطاریہ دے رہا تھا۔ کمنو نے بنگوں میں ہاتھ ڈالے تھے اور دیکھتی رہی۔ کوکھیتی رہی۔ پھر علی بڑے سے بولی۔

”اے ہاتھ! بارہ مولے کب جا رہے ہو؟“

”جد پیسے ہو جائدیس (جب پیسے ہو جائیں گے)“

”جو پیسے میں دسے، دیندیس (اور جو پیسے میں دسے دوں تو؟)“

”آہی، ہوسنے جائدیس (ابھی اسی وقت چلا ہاؤں گا)“

علی جو نے ہاتھ کے فلفظ کا برا نہیں منایا۔ کمنو چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح آتی اور ہر ایک سے سمیر چھاڑ کیا کرتی۔ — ٹھیکہ بٹار۔ ہم بھی شیخ کے نقطہ نگاہ کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے۔ کمنو بہت آزاد لڑکی ہے۔ وہ یونہی ہر ایک سے ہنس کھیل لیتی ہے۔

اس وقت عمارت کھڑکیوں کی کارنس تک پہنچ چکی تھی۔ ہمارا عملہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔

کارٹوں سے ددر دے ادھاٹنے پر ایک خوش پوش نوجوان کسی الیکٹرک گاڑی کا پورٹ لے آیا۔ اور اسے بلاک کے ساتھ والی سڑک کے کنارے شیشم کی چھاؤں اور زبڈوں کے سامنے گاڑ دیا۔ اس پر لکھا تھا "الیکٹرک اسٹیشن بائی راج اینڈ کمپنی" اس کے بعد تاروں کے گورکھ دھندے، گٹیاں اور سفید سفید کٹ آؤٹ آئے گئے۔

ایک دن پھر شیخ جی میرے پاس آئے۔ آج پھر انہوں نے بھینس کی حصول پیٹ رکھی تھی جب وہ کبھی بہت رازدارانہ لہجے میں بات کرنا چاہتے تھے تو وہ بھینس کی حصول پیٹ بچتے تھے میرے پاس آتے ہی بولے۔

”اب کسو بھاگ جاتے گی“

میں نے کہا ”ہیں!“

”تم نے کچھ تبدیلی دیکھی ہے؟“

میں سوہنے لگا۔ میں نے کیا تبدیلی دیکھی ہے..... کیا تبدیلی؟

”کیا تبدیلی؟“ میں نے شیخ سے پوچھا۔

”بس اب دیکھنا۔“

”تو تو؟“

”بس کہہ جو دیا دیکھنا“

”پھر بھی“

”بس کہہ جو دیا میں نے“

میں نے سپنا کر زیادہ کر دینہ کی۔ دوپہر کو جب کسو باہر نکلی تو وہ مدھن سے مسمیٰ، شرابی ہوئی تھی۔ یوں تو اس نے ہر ایک کے ساتھ باتیں کیں لیکن آج ان میں کچھ

گھر میں

اکھڑا ہنسا تھا۔ دلاور سنگھ، شیخ جی، اسد علی، علیا، گنتی، بجلی کے ستری سہی کے ساتھ وہ بولی
لیکن علی جو کے پاس سے گزرتی۔

شیخ نے کہا: ”تم نے دیکھا؟“

میں نے کہا: ”ہاں شیخ، میں نے دیکھا۔“

اس کے بعد ہم شام تک گھر اسے ہوئے اوپر اوپر پھرتے رہے شیخ جی اور میں۔
آج کا دن مبارک تھا۔ آج علی جو نے زمین کا پتھر ملا کٹر توڑ ڈالا تھا اور نل زمین میں پانی
مک چلا گیا تھا۔ نلکے کے ستری نے کٹر ٹوٹنے کی خوشی میں پٹاٹے تقسیم کر دائے
علی جو غادر ہو چکا تھا اور آج رات وہ چلا جانا چاہتا تھا۔

شام کے قریب جب زمین کے کوسے گھر جانے لگے تو ہمیں راستے صاحب کی تلاش
ہوئی۔ اس وقت اوڑوں کی آڑ میں سے شیخ جی نے مجھے کچھ دکھایا — وہ دیکھو
سامنے علی جو کھڑا تھا۔ کوٹھی کا ایک دروازہ بالکل معمولی طور پر کھلا ہوا تھا اور تو علی جو
کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی!

علانی

آخر تیس سال کی طویل ملازمت کے بعد منشن پا کر پولورام گھر پہنچا۔ گھر کے سب
 چھوٹے بڑے اس کے منتظر تھے اور اس کی بیوی سرسوں کا تیل لئے کھڑی تھی۔ کب
 پولورام آئے اور وہ دہلیز بھانڈنے سے پہلے چوکھٹ ہتھیل گراوے اور پھر فوت
 اپنے بڑے بیٹے کو اشارہ کر کے کہ وہ بچوں کا ہار اپنے ہڑ سے باپ کے گلے میں ڈال
 دے۔ چنانچہ سرسوں کا تیل گرانے کے بعد ہاروں سے لہستہ بھندے پولورام کے گلے
 میں فوت نے بھی ایک اور پہنا دیا۔

چوکھٹ ہتھیل رکھتے ہوئے پولورام سوچ رہا تھا ایہ بھول کتنی دور دور سے آتے
 ہوں گے اور بھلیرے نے ان سب کو ایک آگے میں پر دیا ہو گا اور ان بچوں کی قسمت
 میں بد اثر ہو گا کہ وہ میرے گلے کی زینت ہوں — سیری عزت افزائی کے

گرھن

نے ایک جاہلوں..... اور دفتر میں کتنے بابو اکٹھے ہو رہے تھے۔ کوئی میاں والی
لاہت تھا کوئی بھمبر کا بٹ — گویا دور دور سے آتے ہوئے پھول تھے اور
مقرر کے پھلیر سے انہیں یک جا کر دیا تھا۔ میری زینت کے لئے میری عزت
افزائی کے لئے!

پولورام کا ریشاڑہو نا بھی ایک ڈراما تھا۔ نوکری سے بلکدوٹ ہونے کے بعد
جب وہ گھر آنے کے لئے سڑک پر ہوا تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ بلکدوٹ ہو چکا
ہے اور اس مرفی بیاہنرول جس پر سینکڑوں مرتبہ دفتر کو آیا ہے اب جینے میں ایک
بار آیا کرے گا — پنشن پانے کے لئے..... فٹ پاتھر پاؤں رکھتے مجھے
اس نے پس پشت دفتر کی نو لبورت، گوٹھک تو سوں کی طرف دکھایا۔ سیٹیل میں بڑا
کلاک گڑا ہوا تھا..... ”جھی!“ پولورام نے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے
”سالار روز اول ہی سے گڑا ہوا ہے۔ کبھی ٹھیک نہیں ہوا۔ جب میں نیا نیا ڈاک کے
اس نمکے میں ملازم ہوا تب بھی ایک گھڑی ساز گھنٹے کی سوئی کو نمٹوں کی سوئی سے نجات
دلائے کے لئے کلاک تک پہنچنے والی سیرس پر دینگ رہا تھا“

سیتو نے سوچ میں مستغرق شوہر کے منانے کو چھوئے ہوئے کہا: ”جھوٹی ہو
آئی ہے..... اور بد سائی دیتی ہے“

پولورام مسکرایا اور جذبات کی ایک لطیف زد میں بہ گیا۔ ”جھوٹی بہو بد سائی
دیتی ہے..... جھوٹی بہو ہتی بڑی اچھی۔ دونوں بڑی بہوؤں سے اچھی ہے۔ اس
کی رگوں میں شرفا کا خون دوڑتا ہے۔ بڑے بیٹوں کی شادی کے وقت میں اتنا متمول
ہی کہاں تھا کہ کوئی خاندان سے رشتہ کی توقع رکھتا“

اور جب سوتنے پوہورم کو بار امار دینے کے لئے کہا تو پوہورم گہری کی سی آواز پیدا کرتے ہوئے ہنسا اور بولا: "ہاں، فوت کی ہاں..... یہ بھی میری طرح اپنی نوکری سے سبکدوش ہو چکے ہیں..... ہی ہی..... گویا انہیں بھی اب فیشن مل جانی چاہتے..... ہی ہی ہی....."

دیتے چلنے پر لال چوک کے بہت سے آدمی مبارک باد کے لئے آئے۔ پوہورم کے ہاں ایک کنواں معاجس کا آٹو صاحبہ لال چوک میں کھلتا تھا۔ مسلمانوں اور ولت جاتیوں کے سوا لوگ اس میں سے باہر ہی بے پانی لے جاتے تھے۔ جب لال چوک کے آدمی آتے تو پوہورم کنوئیں کے اندرونی منڈیر کے پاس ایک خالی جگہ کو دھوئے ہوئے اس میں ٹھاکروں کو کھانا پین کر رہا تھا..... اب جبکہ وہ نوکری سے فارغ ہو چکا ہے وہ صبح شام ٹھاکروں کے سامنے کھڑا نہیں بایا کرے گا اور برہانند کے بھجن گاتے گا۔ تینیس برس کی طویل ملازمت میں پوجا پاٹ کی فرست ہی کہاں تھی؟ پھر اس نے لال چوک کے آدمیوں کو تجایا کہ وہ کسی بڑے سے بڑے صاحب کی وٹنس نہیں ہنسا تھا۔ ہارڈیکر صاحب سے تو اس کی لڑائی ہی ہو پڑی۔ اکاؤنٹ کا چھوٹا معاملہ تھا۔ ان دونوں وہ ملکیشن گریڈ کا پرسٹ ماسٹر تھا اور اس گریڈ کے پرسٹ ماسٹر کی بڑی طاقت ہوتی ہے۔

"میں نے ہارڈیکر صاحب سے کہا: "پوہورم بڑی ملکنت سے ٹول پر بیٹھے ہوئے بولا..... کیا آپ اس معاملہ میں دخل دے کر میری طاقتوں کو روک سکتے ہیں؟ پہلے تو وہ نہ اتنا اور معاملہ پرسٹ ماسٹر جنرل تک جا پہنچا۔ حیت ٹھی کی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہی صاحب میرے دفتر کے معائنہ کو آیا۔ سب لوگوں کا خیال تھا کہ اس مخالفت کی بنا پر

صاحب بہت کچھ میرے خلاف لکھے مگر جس سے میری فیشن میں فرق پڑ جائے گا اور کیا
عجب جو مجھے ڈی گریڈ یا ان فٹ ہی کو دے۔ لیکن اس نے میری غیر معمولی تعریف کی
..... جناب یہ انگریز لڑکے بہت فراخ دل ہوتے ہیں۔ یہ بہادروں کی قدر کرنا
جانتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ پرانے، مکینہ جھگڑوں کو کھول بھال جاتے ہیں۔
میں نے بچپن میں بھڑائیہ یا شاید تارنخ میں پڑھا تھا کہ انگریزی راج میں سورج کبھی
غروب نہیں ہوتا..... اگرچہ میں اس کا مطلب نہیں جانتا تاہم میری دعا بھی
یہی ہے کہ انگریزی راج میں سورج کبھی غروب نہ ہو..... اور دیکھیے انخلا
اس کے کہ اگر کہیں ایسی سرزمین تو نہایت کینگی سے پیش آتا۔ میری زندگی تباہ کر دیتا۔
ایٹور کرے ان ویسے لوگوں کا سورج کبھی طلوع نہ ہوا ۴

شام کو جب پولو رام کھانا کھانے کے لئے بیٹھا تو اس کے بیٹے، اس کی بہنیں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ خدا ہانے کس نے یہ ذکر چھیڑ دیا۔ غالباً چھوٹی بہن ہی نے چھیڑا ہو گا۔ وہی کول غاندا ان کی لڑکی تھی۔ اپنی ننھی بچی کو ان کا کوٹ پہناتے ہوئے بولی اور تو اور میں حیران ہوتی تھی، پتا چلی کیسے گڑا کے کی سردی میں سو رہے ہیں نہا لیتے تھے۔ سال کے تین سو سو پٹھ میں سے ایک بھی تو ناغہ نہ ہوا۔

پولسورم انگلیاں چاٹتے ہوئے بولا میں اپنی نوکری کا بہت پابند تھا بیٹا! اور اسی مہینے سال کے لمبے عرصے میں کوئی بھی ایسا موقع ہو گا جبکہ میں نہایا نہ ہوں اور صبح ہی نہا کر دفتر نہ چلا گیا ہوں میرے سب انسر مجھ سے بہت خوش تھے :

و منستی ہو بلکہ کرتی بات کرنا چاہتی تھی۔ بولی ہم جو انوں سے تو پتا ہی اچھے ہیں۔
دیکھو تو ہم اب بھی کیسے کھا پیوٹ کر پڑی رہتی ہیں۔ آٹھ بجے کے پہلے کر دٹ نہیں

گرم

بولیں اور آپ ہیں کہ اسے پڑے پر بھی نہایا اور بحث سے کام پر بھی چلے گئے ؟
پروفیسر مومینتی کو اس کے دیر سے اٹھنے کی عادت پر بہت لعن طعن کیا کرتے
تھے لیکن اس وقت وہ نہاتے ہوئے کوسے کی طرح بھولی گئے بوئے دبیا انہیں کاغذ
کی پٹی ہے ۔ ہمارے جیتے جی خوب ہنسو، کھیلو، مسود۔۔۔۔۔۔ جیسے تمہارے ماں
باپ مکے میں تھے دیسے یہاں بھی ہیں ۔“

بڑی بوہ کی آنکھیں نناک ہو گئیں۔ پوہورام نے پردے کی وجہ سے نہیں دیکھا لیکن سیتونے بوہ کی ڈنڈ بانی ہوئی آنکھیں دیکھ لیں۔ کہاں تو وہ بڑی بسوسے لڑتی ہی رہتی تھی۔ کہاں اس نے برتن انجھنے چھوڑ کر اپنے راکھ سے آلود و ہاتھ جھاڑے اور ہاتھوں کو مہر کی کمر میں ڈالتے ہوئے بولی ”اور تو کیا جھوٹ کہتے ہیں؟ تم کیا جانو ہم تمہیں کنسا پیار کرتے ہیں۔۔۔۔۔ پس جو اتھاری زبان قابو میں ہو جائے نا۔۔۔۔۔ نہ جانے اس وقت کیا ہو جاتا ہے تمہیں؟“

دوستی بڑی شرمناک ہوئی "میں تو فتنی کرتی ہوں ایشور سے کہ آپ کا سایہ سات جہنم تک ہمارے سر پر قائم رہے آپ مارتے ہیں - پیار بھی تو کرتے ہیں - جو پیار کرے وہ مارے اچھڑکے لاکھ بار"

جانے چھوٹی بہو کو رشک آیا۔ بول: ”پتا جی نے مجھے پرانگ لے جانے کا وعدہ کیا ہے۔“

اب تک پولورہم بابرو منیتی کے جذبات کو مان چکے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا
 آئیں، کہنے لگے جھوٹی بہو کو مزہ پر یاگ سے ہاؤں گا۔ ہاں، فوجت کی ماں! میں نے
 اس سے وعدہ کیا ہے اور ٹری کو بھی لے چلوں گا اور شعلی کو بھی..... پھر کیا تم

پیچھے رہ ہاڑگی فوٹ کی ماں؟ کھلے موسم میں سبھی کو لے چلوں گا۔۔۔۔۔“
 — اور پولو رام کے لب و لہجے سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ سچ سچ سب کو
 پرہیز ہی تو لے جائے گا۔ وہ بڑے گھر کی لڑکی اس بات کی حقیقت سے واقف تھی۔
 جب وہ نئی نئی بیاہی آئی تھی تب بھی تو پتا چلی تھی کہ کتنے کا وعدہ کیا تھا اور اب کہاں گیا
 وہ وعدہ؟

اگلے دن پولو رام باہر کی آنکھ پانچ بجے کھل گئی۔ اس نے سوچا وہ اتنی جلدی
 جاگ کر آخر کیا کرے گا؟ اس نے ایک ہاتھ سے رنگپوری پھینٹ کا پردہ اٹھایا اور
 درپچھے کسٹیشن میں لال چوک کی طرف بھانکا۔ کمیٹی کی قیوں کو بھانانے کے لئے
 کمیٹی کا لازم سیر بھی کندھے پر رکھے، آہستہ آہستہ پانچ شاہ کی طرف جا رہا تھا۔ قیوں
 کی بے بضاعت روشنی میں پرے، ایک بھینسا گاڑی اپنی تمام ہندوستانی سست
 رفتاری سے ریگ رہی تھی، ان گاڑیوں کے لئے نیوٹک مارٹر بھی پہنچانے کی فراہم
 و دیکس سے کمیٹی میں پیش ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود کمیٹی اور بھینسا گاڑی دونوں کی
 غماش تھی کہ وہ دن ہونے سے پہلے پہلے شہر نہا، سے باہر ہو جائے۔ پولو رام نے
 اپنا سرگرمی میں لپیٹ لیا اور سونے کی کوشش کرتے لگا لیکن فائدہ نہ آیا۔ وہ اٹھ کھڑا
 ہوا اور معمول کی طرح بولا بیسیٹے، اٹھو نا، مجھے چار بنا دو۔“

سیٹو روزمرہ کی طرح چار بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن جیسے ہی اس کے
 پاؤں ٹھنڈی کھڑاؤں میں داخل ہوتے اسے کچھ یاد آگیا۔ بول نہ کہہ رہا ہے میں آپ؟
 کوئی دفتر تو نہیں جانا ہے پڑے رہنے چکے سے“

پولہورام بابو بولا کہ صبح جا رہا ہوں میں؟ کیا؟ اری بھئی! سیر کرنے بھی نہ جاؤں؟

لیکن سیتو نے تو شاید سوچا تھا کہ ان کے فیشن پانے پر وہ بھی صبح کی چار کے صبحیٹ سے چھوٹ جلتے گی اور اپنی بہنوں کی طرح بڑے سہزے سے اپنے خاوند کے پہلو میں پڑی رہے گی۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ فیشن تو صرف مردوں کو ملتی ہے۔ کبھی عورت کو بھی فیشن ملی ہے؟ گھر میں تو روز کو کوئی ہوتی ہے اور روز فیشن اسے اٹھنے میں بہت وقت پیش نہ آئی۔ پولہورام نے اسی وقت کپڑے اتارے اور معمول کی طرح جلدی جلدی پانی کے کچھ ڈول نکال کر جسم پر اندیل لئے۔

چار بیٹے کے بعد پولہورام نے اتنے اونچے شروں میں برہما نند کے بھجن گاتے کہ سارا گھر جاگ اٹھا۔ بودی بڑا بڑا سنے لگیں، اور بچے روسنے لگے۔ پاٹھ کے بعد پولہورام سیر کے لئے نکلا۔ ایک دو گھنٹے تک تو وہ ریواڑ گارڈن کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ لیکن ریواڑ گارڈن سے بڑا ڈاک خانہ۔ اس کا بلاناؤنٹر وور نہیں تھا۔ پولہورام کے قدم اسی طرف اٹھ گئے۔ اس کی حالت اسی سانپ کی مانند تھی جو بہت عرصے کینچی میں زندہ درگور رہ کر سب اپنی کینچی کو اتار پھینکتا ہے تو بہت درد بھاگ جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک بار اسے دیکھنے کے لئے ضرور داپس آتا ہے اور سوچتا ہے۔ اس کینجھت نے مجھے کسست غار کھا تھا؟ میری مینائی کمزور ہو گئی تھی؟ میں ابھی طرح سے بل بھی نہ سکتا تھا۔ اس کینچی نے اس بھٹی نے اس چمکتی ہوئی ستیر بھٹی نے!

ڈاک خانے کے سامنے پہنچ کر پولہورام کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے سامنے گارڈیاں

سرخ دروی پہنے قطار در قطار کھڑی تھیں، اور ان پر نیا پالش کیا ہوا جی، آرا آتی، ہچک سنا
 تھا چٹھیوں کے کمرے میں سارٹنگ پوسٹ میں ایک مشین کی سی سرعت سے چٹھیاں در ڈبوں
 میں پھینک رہے تھے۔ پولورم نے کہا۔ انہی چٹھیوں نے تو مجھے بھگوان بھلا دیا تھا۔
 یہیں مجھے رمر کی شکایت شروع ہوئی تھی۔ آج میں ایک پرندے کی طرح
 آزاد رہے نیاز ہوں۔ اسی دفتر میں میں صبح تاروں کی چھاؤں میں آتا اور رات تاروں
 کی چھاؤں میں داپس جاتا تھا۔ درمیان میں دوڑاڑھائی گھنٹے کی چٹھی ہوتی۔ لیکن وہ بھی
 ایسی کہ نہ تو دفتر رہ سکوں اور نہ گھر جا سکوں۔ اگر گھر جاتا تو شام کی حاضری سے زیر ہو جاتی
 اور اگر دفتر ہی رہتا تو بھوکوں مرنے لگتے تھے۔ اسی لئے تو میں نے روٹی بھی دفتر ہی لے جانے
 کا معمول بنالیا تھا۔ اور شام کے وقت جب کسی ابو کے حساب میں
 فرق پڑتا تو رات کے دس گیارہ بج جاتے اور پولورم ان سب باتوں سے مالوم
 ہو چکا تھا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کام ختم کرنے کے بعد بھی وہ دفتر کی میز پر ناگین سرے
 بیٹھا رہتا اس کا خیال تھا کہ دیر تک کام کرنے والے سے صاحب لوگ بہت خوش
 رہتے ہیں۔ اس کی ناکھوں کے سائے پرندے سارا دن سر اور اس کے مضافات میں
 دانہ دنگا چلنے کے بعد نسل جوانی سے گھر کی جانب بے تماشہ کچے جاتے ہوتے دکھائی
 دیتے تھے لیکن پولورم نے اپنے ہم قدرتی احساسات کو غیر قدرتی فنونوں کے تابع
 کر دیا تھا۔ اور اس میں گھر جانے کی قدرتی حس مرطوب تھی جب دفتر کے باقی بابو چلے جاتے
 اور غاکو وب قیام بھجانے کے لئے ہال کے دوسرے سرے سے آتا ہوا دکھائی دیتا
 تو پولورم کو محسوس ہوتا کہ وہاں اس کے پڑھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور اب
 اسے گھر جانے کے سوا چارہ ہی نہیں۔ اس وقت وہ اپنی لوبہ کی چھڑی جس پر سے

گروٹ

تمام پالش اڑ چکا تھا تاہم کڑنا اور گھر کی صحت چل دیتا اور دفتر سے گھر جانے کے بجائے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی گھر سے دفتر ہمارا ہے۔

میل ٹرمینل کا مصطل بہت پرانا ہو چکا تھا اور لمبی لمبی درزیں مصطل سے بیکار ٹرمینل تک چلی گئی تھیں۔ پولورام نے سوچا ابھی کل ہی تو اس نے مرست کے سلسلہ میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر کو ہتھار دیا تھا۔ شاید اس کا جواب آچکا ہو۔ اس کے دل میں اس کیس کا جواب جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن وہ ایک دو قدم چل کر ٹک گیا۔ اسے کیا؟ اس کے لئے تو خواہ ایک زلزلہ آجائے اور اسے کاساراریکا ٹرمینل نیچے آ رہے اور سب ضروری اور غیر ضروری دیکار ڈنراب ہو جائے تو اب اس کی غنی کو آنا چاہیگا۔ پولورام نے سوچا۔ لام کرنے والے کی قدر اس کے بعد ہوتی ہے۔ میں بارہ گھنٹے کی لگاتار نوکری دیتا تھا۔ اب محکمہ کو مجھ ایسا ونا شعار آدمی کہاں ملے گا؟ جب بھی کسی صاحب آواز دیتا فوراً ہی میرا جواب آتا۔ ”جی حضور!..... اور صاحب مجھ سے کتنا خوش تھا۔ کتنا تھا پولورام کتنا پابند آدمی ہے۔ سب ہندوستانیوں کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ پابند ہم نے بہت رات گئے اسے لام کرتے دیکھا ہے۔ اس سے دفتر کی ایفیفیسنسی (EFFICIENCY) بڑھتا ہے ہم ہی کی ایکسپریڈ پروڈکشن کی سپارڈش کرے گا۔

پولورام نے سوچا اب لام کرتے ہوں گے اور اپنی جان کو روکتے ہوں گے۔ معاً پولورام کو خیال آیا کہ جس شخص کو اس نے چارج دیا ہے وہ تو زلزلہ کا وہی ہے۔ یکسر ٹریڈ آفس کے دو کیس ہیں جنہیں میرے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اسے میری ضرورت کس شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہوگی۔ ہو لے ہو لے پولورام اس کمرے کی طرف ہو لیا۔ جہاں وہ ہر روز

بیٹھا کرتا تھا۔

دور کھڑکی میں پولورم کو اپنے قائم مقام کا منظر آنے لگا۔ وہ کانغذوں پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی اٹھا اور کسی ضرورت سے برآمدے کی طرف چلا آیا۔ پولورم نے بھاگ جانا چاہا لیکن وہ بھاگ نہ سکا۔

اچانک اس کے قائم مقام کی نظر پولورم پر پڑی اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ”لو، پولورم، اچھی کیا حال ہے آپ کا؟“

”اچھا ہے“ پولورم نے جواب دیا۔

”کیسے تشریف لاتے آپ؟“

”یونہی — خط ڈالنے چلا آیا تھا“

اس کے بعد وہ بابو ہنسا اور قریب ہی کے ایک کمرے میں گم ہو گیا۔ اس نے فائلوں کے متعلق پولورم سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ پولورم سخت حیران تھا۔
مجھے کیا میرے لئے اب فائیں خواہ برس بھر بنا جواب دیئے پڑی رہیں مجھ جی کو جارج شیلٹ لگے گا۔ ترقی رک جائے گی پھر مزہ آئے گا۔

پولورم کے پاؤں جو کہ میر کی وجہ سے ٹھک گئے تھے وہ اب گھر کی طرف رہنے لگے۔ لیکن اسے پھر خیال آیا کہ کیا محبوب جو بابو کو ان کانغذوں کے متعلق جو کہ میں نے پگلی ورازی میں غصیہ کا نشان دے کر رکھے تھے کچھ نہ ہی ہو سکی کہ اور کنوئیں میں ڈال۔ اس نے اگر نہیں پوچھا تو میں ہی بتلا دوں۔ احساس میں ہرج ہی کیا ہے۔ وہ میری جان کو رعایت دے گا۔ اور پولورم اپنے قائم مقام کی طنز آمیز مسکراہٹ کو بھول ہی گیا۔ جب بہت جمع کرکے پولورم نے اپنے قائم مقام کو کانغذوں کے متعلق تاکید کی تو

گھر میں

اسے پتہ چلا کہ اس نے تمام کانڈورا میں سے نکال لئے تھے اور ان کا مناسب جواب بھی دے چکا تھا۔ پولورام نے سوچا غلط سلط جواب دے دیا ہو گا اور پھر پولورام اپنے قائم مقام کے ہونے والے حشر پر آنسو بہاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔

گھر پہنچتے ہی پولورام نے پھر ادنیٰ آواز سے گانا شروع کر دیا اور ہر روز یہی ہوتا رہا۔ بچے پہلے تو ڈر کر اپنی ماؤں کی گوریوں میں چھپ جاتے پھر اس قسم کی پوجا سے مایوس ہو گئے اور دادا کے ساتھ ہمنوا ہو کر محلہ کو سر پر اٹھانے لگے۔ بہوؤں کو بڑی وقت پیش آتی تھی۔ پہلے دو گھر میں آواز اٹھو مگر قتی تھیں لیکن اب انہیں ایک لمبا سا گھونٹ نکالے اندر باہر جانا پڑتا تھا۔

اور پولورام جاتا بھی کہاں؟ گھر کے سوا اس کا ٹھکانا بھی تو کہیں نہ تھا۔ اس کی شہر میں واقفیت تو غنی لیکن ایسی تو کسی کے ساتھ نہ تھی کہ اس کے پاس حماراں ہی گڑا رہے کبھی کبھی وہ گھر اور ام پان فروش کی دکان پر جا بیٹھتا۔ اور محلہ کی بدچلن عورتوں کی باتیں کیا کرتا اور کبھی کھانڈ کی دکان پر کھانڈ کا روز مرہ بدینے والا بھاد پوچھنے چلا جاتا۔ پولورام کھانڈ کے نرخ میں اتار چڑھاؤ سے قومی بلکہ بین الاقوامی حالات کا اندازہ کر لیتا تھا۔ اس کے سوا اور اسے کوئی شغل نہ تھا۔ اس نے چٹھیوں اور مٹی آرڈروں کے سوا اور سیکسا بھی کیا تھا۔ اس روز مرہ کے شغل پر ایک ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوتا اور اگر کہیں اسے اجاب کا پوچھ مل جاتا تو زیادہ سے زیادہ دواڑھائی گھنٹے گزر جاتے۔ اس کے بعد گھر جانے کے سوا چارہ ہی نہ تھا اور گھر پہنچتے ہی وہ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتا۔ یہ سلائی کی مشین بلا ضرورت بھلا یہاں کیوں پڑی ہے؟ اور یہ میل کی کپتی

گھر میں

اور ابھی تک کسی نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ خدا جانے اس گھر میں چار عورتیں کتنی کیا رہتی ہیں اور ان بچوں کو روزانہ مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا۔ . . . غرضیکہ پولورم اتنا چڑھتا کہ ثابت ہو رہا تھا کہ ہوویں تو ایک طرف غور سے بھی اسے محسوس کرنے لگی تھی۔

ایک دن پولورم دن بھر لڑتا جھگڑتا رہا۔ اور سب کا خیال تھا کہ آج کالی گلیچ مار پیٹ ہو کر رہے گی لیکن شام کے قریب نوبت راتے پولورم کا بڑا لڑکا آیا تو پولورم نے پوچھا: ”وہ پچیس روپے کو منسی آرڈر کروادیا تم نے؟“

مگر وہ دیا پتا بھی نہ نوبت بر لو۔

”کیا فیس دی؟“

”چھوٹے“

”دیہی! پولورم نے ایک وفد لکھیں بھیلاتے ہوئے کہا اور پھر بے تحاشہ ہنسنے لگا: ”ارے نوبت! کتنا بھولا ہے تو، یہ بھی نہیں جانتا۔ پچیس روپے کو چوٹی کمیشن ملے۔ یہ تو بازار کا ایک گنوار بھی جانے ہے، اور تو جو پولورم ریٹائرڈ اکسٹنٹ پوسٹ ماسٹر کا لڑکا ہے، تجھے اتنا بھی نامالوم لکھیں پر چوٹی فیس دی جاتے۔ . . . ہا ہا . . .“

”راہ رے واہ . . . ہا ہا . . .“

اور پولورم کبھی خفا ہوتا اور کبھی ہنسنے لگتا۔ چھوٹی ہو بھی منسی میں شریک ہو گئی۔ بولی۔

”میرا جیٹھ تو ہرچ ہرچ بھولا ہمیش ہے۔ دو فی مفت میں زیادہ دے آیا۔ اور اب ہی مجھے دوئی۔ ان بہن! ہم یہ وہ توئی سنا بھٹے کھاتے میں نہ کھنے دیں گے۔ . . . دوئی کا ٹک ہی آجاتا ہے۔ حارامینہ چل جاتا ہے دوئی کا ٹک“

چھوٹی ہو بڑے گھر کی لڑکی تھی نا۔ وہی پولورم کے ساتھ عادات پر متفق ہوتی تھی۔

دو ذول امیر اور فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ پولہو رام نے کہا:۔۔۔۔۔ بابا۔۔۔۔۔
پچیس پرچہ آنے میں دسے آیا۔۔۔۔۔ ای ہی کمی کمی۔۔۔۔۔ اور نوبت بھی
ساتھ لی کہ ایک کھیانی سی مہی بننے لگا۔

پہلے ہوئے پولہو رام نے پوچھا: "کون تھا بابو؟"

نوبت رائے نے بڑے لمبے پورے طریقے سے بابو کی شکل بیان کی۔ وہ موٹا
تھا۔۔۔۔۔ لیکن موٹے تو سب ہی بابو ہوتے ہیں۔ اس کے ننھے چھوٹے ہونے
تھے۔ پولہو رام بولا: "ننھے تو کئی بابوؤں کے چھوٹے ہونے ہیں" اس کی
ہنکھیں بے تماشا تبا کو پینے سے بہت میل ہو چکی ہیں لیکن آنکھیں تو درجنوں بابوؤں کی
میل ہیں، اور آج کل تو ہر ایک بابو بے تماشا تبا کہ جیتا ہے۔ آخر کئی سے سمجھ میں آیا کہ
بابو رپ کشن نے ہی دونی زیادہ سے لی ہوگی۔ رسید پر بھی تو اسی کے دستخط دکھائی دیتے
ہیں۔ وہ ہے ہی پاجی، بڑا کمینہ آدمی ہے، عیاش ہے، فاسق ہے۔ ایک عورت بن بائی
ڈال رکھی ہے۔ وہ ایسی باتیں کرے تو گزر کیسے ہو اور آخر تان یہاں ٹوٹی۔ اسے!
تو اتنے بڑے پورے اسٹرکٹ لگا کر ہو کر دوئی زیادہ دے آیا۔۔۔۔۔

نوبت اور اس کی بیوی دینی شرم سے گردن جھکاتے رموتی میں دبکے رہے۔
نوبت اپنے گھٹنوں میں سر دیتے کچھ سوچتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رد دے۔ لیکن
وہ اپنی چھوٹی بھاد بھوں کے سامنے نہیں روتے گا۔ عجب دہسوئے کے لئے جائے گا تو
اپنی بیوی کی گود میں سر رکھ کر کہے کہ تبا روئے گا اور خرب ہی دل کا بخار نکالے گا۔
اس دقت تو وہ چھوٹے کے پاس میٹھا ہوا ایندھن کے چھوٹے چھوٹے تنکے اٹھا اٹھا
کو جو الامیں پھینکتا رہا۔

شام کے قریب دروازہ کھٹکھٹاتے جانے کی آواز آئی۔ پولوہرام نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ اس کا قائم مقام تھا۔ پولوہرام کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ وہ اسے کچھ کہے بغیر ہی اسٹے پاؤں اندر بھاگ آیا۔ سمو سے لاسے اور جاتے جانے کا حکم دے کر خود بیچک میں چلا گیا۔ اور بڑی عزت و تکریم کے ساتھ اپنے قائم مقام کو اندر بٹھایا۔ اس شخص کو کسی کیس میں پولوہرام سے مشورہ لینا تھا۔ پولوہرام نے فوراً امدادی سے پرانی دایوم نکالی اور اس خاص موضوع پر تمام رول اس کے سامنے رکھ دیے اور پھر وعدہ کیا کہ وہ تمام رات بیٹھ کر ان نکتوں کے مطابق ڈرافٹ تیار کرے گا۔ پھر اس نے باور و پکشن کی شکایت کی اور اس کا قائم مقام مخصت ہوا۔

اندر آتے ہی پولوہرام بولا یہ وہ سب کہتے ہیں میرے بغیر دفتر چوٹ ہو رہا ہے۔ یہ بالو بھی میری طرح اڑھائی متخواہ پاتا تھا۔ — ہے اور مجھے مشورے کے لئے اتنی دور سے چلا آیا ہے۔ ایک دن کوئی آدمی متان سے میری شہرت سن کر آیا تھا۔ صاحب کتنا تھا مجھے پولوہرام پر ناز ہے اور یہ ہے میرا بیٹا جس نے میرے نام کو لاج لگادی ہے۔

اور ریٹائر ہونے کے اس چھ ماہ کے عرصے میں آج شاید پہلا دن تھا۔ جبکہ پولوہرام سرورہ نظر آتا تھا۔ آخر اس کا قائم مقام اتنی دور سے مشورہ لینے کی غرض سے آیا تھا۔ پولوہرام سارا دن گھانا رہا۔ — کچے تانگے سے کچھی آئے گی سرکار میری — اور اسے خوش و کیوں کر چھوٹی ہوئے اپنے بچے کو تاجی کی گود میں دیکھیں۔ یا۔

تاجی بولے "چھوٹی ہو کتنی اچھی ہے۔ دیکھو اسے سامنے گھر کے لئے دونی کے نمک کا خیال آیا اور تو کتنی بڑی خراب ہے۔ مجھے اپنی بیٹی کے سرا اور کچھ موصفا بھی

گرمی

نہیں، اور شافو — شافو ہے بھی تو بہت پیاری بس اسے دیکھتا جائے آدمی ..
 دیکھو کیسے منگھیں موند لیتی ہے ات چگی اور
 میں اسے لادوں گا ایک ملائم سی گڑیا اور سیتو بال میں نے سیف میں دو دھیلے بھی
 رکھے تھے لانا ذرا ود۔ ایک منے کو دوں گا اور ایک منی کو " اور چھوٹی ہو سرت کے
 احساس سے بولی پتا جی! آپ نے مجھ سے رس گلوں کا وعدہ کیا ہے "
 پولورام بولے " میں بانتا ہوں تو بہت شوقین ہے رس گلوں کی۔ میں ایک ..
 دو تین روپے کے رس گئے ملاؤں گا اور بڑی ہو کے لئے مالا ملاؤں گا
 اور منجلی کوئی دوسری ہے دو بھی تو اپنی ہی بیٹی ہے نا ایسے ہی جیسے دینی میری بیٹی ہے ؟
 دینی، بڑی ہو اپنے شوہر کی ددنی کو بھی بھول گئی اور دل میں سوچنے لگی۔ پتا جی بھی
 ایسے بڑے کیا ہیں۔ مارتے ہیں تو یہاں بھی تو کرتے ہیں، اور نوبت رائے اپنی بیوی کے
 اس انحراف پر دل ہی دل میں اسے کو سنے لگا۔ پولورام نے سب سے رس گلوں کا
 وعدہ کر لیا اور چھوٹی ہو سب کچھ سمجھتی تھی اور کہتی تھی۔ بس کس گئے ہی تو آجاتیں گے۔
 کنگن بھی آگئے، پر یاک بھی ہو آئے۔ نوبت کی ماں سمیت اور فقط
 رس گلوں کی کسر ہے —

پولورام نے تمام رات باگ کر ڈرافٹ تیار کیا اور صبح جب وہ دفتر میں پہنچا
 انداز سے داخل ہوا تو اس کے تادم مقام کے سوا اور کسی نے اس کی پروانہ کی صاحب
 بھی تینوں مرتبہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر گزیر گیا۔ بھگو ناکروب نے بھی اسے
 قابل اعتناء نہ سمجھا۔ پولورام نے باور و پکشن سے دینی نامی گروہ صاف کر گیا۔

پولہورام نے سوچا شاید نوبت نے وہ دونی دہشتی کو کچھ لادینے کے لئے اڑالی ہوگی۔ ضرورت تھی تو گوگدھا صاف مانگ لیتا۔ یہ ایک لینے والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی خیر اگر محل کر اس سے پوچھا جائے گا۔۔۔ مگر پہنچا تو نوبت موجود نہ تھا۔ پولہورام اونچے اونچے برہماند کے گھمن پڑھنے کے بعد گھر کی عورتوں پر برسنے لگا اور ان سب کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ خود بھی تو پولہورام اس زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔

کیم کی صبح کو جب وہ ہفتن لینے گیا تو صوبہ کستور نوٹس بورڈ پر پڑھنے لگا۔ ڈاک خانے کو سڑک کے ایک گنجان آباد علاقے میں ایک اکسٹرا ڈیپارٹمنٹل ڈاک خانے کی ضرورت تھی اور اس کے لئے پچیس روپے پیش کر ایہ مکان اور اسٹیشنری ملتے تھے۔

اس وقت اپنے قائم مقام کی مدد کام آئی اور پولورام نے وہ کچیس روپے کی زکری کر لی۔ اب وہ صبح آٹھ بجے ہی نکل جاتا تھا اور رات کو دیر سے غراٹا۔ کام کی کثرت سے اس کا دمر جو کہ معمولی حالت میں تھا، غرناک صورت اختیار کر گیا۔ اوقات مٹی آرڈر بک کرتے ہوئے اسے دورہ پڑنا تو پیسے ایسے رسیدیں سب میز پر بکھر جاتیں۔ اس کا منہ سرخ ہو جاتا۔ آنکھیں پتھر جاتیں اور منہ میں سے کف کے چھینٹے اڑ کر کھڑکی میں سے داخل ہونے والی روشنی کی کرن میں ایک ہستیناک توں قزح کا رنگ بھرتے، منہ، ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ اور اسی حالت میں پولورام کھڑکی کے قریب فرش پر لوٹنے لگتا۔ پبلک کے آدمی کو نثر پر بکھرے ہوئے پیسوں کو اس کے لئے سمیٹتے اور بڑے رحم کی نگاہوں سے اس بوڑھے کی طرف دیکھتے اور کہتے ”ڈاک خانہ کیوں نہیں اس غریب بوڑھے کو مٹھن دے دیا؟“

ہڈیاں اور پھول

آٹھ، نو مہینے کے متواتر استعمال سے میرے بوٹوں کے تلے لگے گئے تھے اور ان میں دو ایک ایسے چھوٹے چھوٹے سوراخ پیدا ہو گئے جن میں سے کچھ داخل ہو کر انہیں گھبرا کر مارنے کے علاوہ میری طبیعت کی عیاشی کے ثبوت یعنی ریشی جرابوں کو خراب کر دیا کرتا۔ ایک قسم کی لچلچاہٹ کی کیفیت میں میرے سوجھ بوجھ اپنے پاؤں اور ان میں متحرک ہونے کی وجہ سے سمٹ آتے۔ میرے دماغ میں کوئی نازک خیال جگہ ہی نہ پاسکتا گو یا میرا دماغ ایک ناقابل گزر و لدل بن گیا ہو۔

اس وقت میں ڈرتا ڈرتا تمہارے پاس گیا۔ تم جیسا کہ میں اسے بطور ایک پڑوسی کے جانتا تھا، ایک تنہائی پسند عصبی موچی تھا۔ وہ کئی بار اپنی بیوی کو مٹا کرتا۔ شاید اسی لئے وہ بیمار ہو کر پکوں سیت میکے بھاگ گئی تھی اور وہاں سے اس نے آج تک

گروہ

رسید کا خط بھی نہ بھجوا تھا۔ . . . تم کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ جس میں دو تین کاریگر ایک مٹی کے تیل کے پرانے لمپ کے نیچے قتلوں اور پروانوں کی بارش کے باوجود بہت رات گئے تک بیٹھے کام کیا کرتے تھے اور مجھے اپنے چوبالے پر سے فیکٹری کے ٹوٹے ہوئے روشن دانوں میں سے نظر آیا کرتے۔

تم کے علاوہ اس کسب کمالی باڑی میں کوئی اور موچی تھا بھی نہیں اور تم بھی عام موچیوں کی طرح کالی باڑی میں سے گزرنے والے ہر راہرو کے پاؤں کی طرف دیکھا کرتا اور بوٹ کی پالش کے حساب سے بوٹ والے کی مالی حیثیت کا اندازہ لگاتا۔ حالانکہ وہ عام موچیوں کی طرح نا سمجھ آدمی تھا اور تھاں تک مجھے علم تھا وہ کچھ لکھ پڑھ بھی لیتا تھا۔ اس کے باوجود اسے بھی بوٹ ہاتھ میں لیتے ہی میں کے قریب مرمت طلب جگہوں کی طرف اشارہ کرنے کی عادت تھی۔ یہاں سلائی ہوگی۔ یہاں بھی سلائی ہوگی۔ اس جگہ سٹار لگیں گے اور یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد ایڑیوں میں پتا لگے گا اور اس پتا کے لفظ سے مجھے بہت چڑھتی۔

کمالی باڑی کے بازار میں دو ٹکڑے کے سب کے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کی دم سونگھ رہے تھے اور تم اپنی آر کو ایک کھردرے، مٹا ہونے والے، نہایت لمبی سے ان آوار بکتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے ایک ساڈا سا لہجے میں صرف اس لئے کلام کیا کہ شاید وہ اس طرح مزدوری کم طلب کرے گا اور کیا معلوم جو وہ چلتے کا ذکر ہی نہ کرے۔

”ان کتوں کا آپس میں متعارف ہونے کا ٹھنک بھی عجیب ہے! میں نے ضرورت سے زیادہ ہنستے ہوئے کہا۔

گھر میں

تم نے بھی اپنے دانت دکھا دئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ گویا وہ کاروباری طود پر مجھ سے انفسل ہے اور میری اس رمز کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ صندوقچی میں سے کیل، بسنی اور موم تلاش کرنے لگا۔ اس وقت دوپہر کا وقت تھا اور کاراگر روٹی کھانے کے لئے کہیں گئے ہوئے تھے۔ پہلے اور غلام چمڑے کے سینکڑوں ٹکڑے اور ہر اکبر سے پڑے تھے۔ تم نے آراٹھائی، اسے پتھر پر گرٹا اور میرے بوٹوں کی سلائی شروع کر دی۔

تم کی خاموشی کی وجہ سے میں سلسلہ گفتگو دراز نہ کر سکا۔ کچھ دیر بعد اپنی رہائی اور بندھی کے سوتی مٹن بند کرتے ہوئے وہ خود ہی بولا۔

”ان کتوں کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کی بات یاد آگئی، بابو جی“
میں تجسس کی وجہ سے خود ہی تم کی بھانگی ہوئی بیوی کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب تم نے ہی وہ سلسلہ چھیڑا تو میں نے رسمی طود پر اس کی طرف نہ دیکھتے ہوئے کہا:

”کتوں سے؟ — گھر کی بات؟“

تم کچھ جمینپ سا گیا اور دوسرے بوٹ کے لئے تلاش کرنے کو مندوچی پر ضرورت سے زیادہ جھک گیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا۔ جیسے میں اس کی بات بہت دلچسپی سے نہیں سن رہا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس صورت میں وہ غصیلاموچی اپنے من کی بات کہہ دے گا۔ چنانچہ اس نے سنی پر موم گرٹنے سے پہلے احتیاطاً ایک بار میری طرف دیکھا۔ اور مجھے اپنی دیاسلائی اور سگرٹ میں نیم توجہ پا کر بولا۔

”انہیں کتوں کو دیکھ کر گوری نے ایسی بات کی جو ان دنوں مجھے بہت سنائی

گرمی

ہے۔ میں اس سے عموماً جلا کٹا ہی رہتا تھا۔ اسے ذرا ذرا سی بات پر پٹیا کرتا اور کہتا،
ہڈیاں توڑ دوں گا تیری۔ حالانکہ وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچ ہی تو وہ کتنی تھی اور اس
کے منہ پر سرسوں کی سی ندوی چھائی ہوئی تھی۔ اس دن بھی ڈوگر محلہ کے سب کتے
کالی باڑی کے اس بازار میں چلے آئے تھے اور ایک بڑا سا کتا ایک کھمبلی ماری
کتیا کے سامنے اپنی دم ہلا رہا تھا جیسے بڑا پیار جتا رہا ہو اور گوری تو جانے کا گ
بھاشا ہی سمجھتی تھی۔ وہ یہاں، اسی جگہ، اسی دہلیز، اسی دروازے کا مہاواٹنے کھڑی
مسکراتی رہی۔ پھر سامنے کتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی:
”دیکھو تو وہ کیسے دم ہلا رہا ہے“

اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک نمونہ کتا بھی کتیا کے بد صورت ہو جانے پر اس
کی محبت کا دم بھرے جاتا ہے تو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے؟ تم جو ایک
شرابی اور بد صورت آدمی ہو۔ روگ تو جی کا ساتھ لگا ہی ہوا ہے اور پہلے میں کتنی تندرت
ہوا کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ کتا غرانے لگا اور اپنے اگلے پنجوں سے مٹی کر بد کر نیچھے کی
جانب پھینکنے لگا۔ شاید وہ اپنے رقیبوں کو مقابلے کے لئے اکسا رہا تھا لیکن میں نے
گوری سے کہا: ”دیکھو تو وہ کتنی نفرت کا اظہار کر رہا ہے۔“ اسے بھی یہ کھمبلی
ماری، مرل ماو پسند نہیں۔“

اس کے بعد وہ چپ ہو گئی۔ پھر جیسے کہ اس کی عادت تھی، اس نے چار پائی
پر لیٹ گئی۔ اس چار پائی پر جس کے نیچے شراب کے خالی پوسے ادا دیئے اور
ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوئے یا ادا ٹوٹے کاگ پڑے ہیں۔ وہ ایک گیت

گنگانے لگی۔ جس میں ایک آدمی اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تو میرے لئے جانے جان ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ تو مر جا، مجھے رنڈ واہونے کا بڑا شوق ہے۔ بابو جی، اس گیت کا مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے۔ میں اس وقت لا کر نہیں سنا سکتا اور مجھے ابھی دوسرا ملا بھی لگانا ہے۔ اور ہاں شاید آپ کو بھی ڈاک خانے جانا ہو گا۔

میں نے بوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ خاموش طبیعت موجی آج کتنا اتونی ہو گیا ہے۔ اور باتونی مزدور کام اچھا نہیں کرتے۔ پھر بھی میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”نہیں تو تم۔۔۔۔۔ مجھے آج چھٹی ہے“

تم نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ آدمی کہتا ہے۔ تو اپنے میکے جا کر مرنا۔ پھر میں وہاں تیرے پھول چلنے، او تیری موت پر افسوس کرنے کے لئے آؤں گا۔ وہ جواب دیتی ہے تم ہرگز ہرگز وہاں نہ آنا۔ میں مر گئی۔ ماں باپ کی چندن کی شہتیری بر گئی۔ تمہارا کیا گیا اور اس کے بعد قضا کار وہ مر جاتی ہے۔ تو وہ اس کی سادھ پر جا کر کہتا ہے۔

گوری، ایک دفعہ تو بول، دیکھ میں کتنی دھوپ میں، کتنی دوسرے پایادو تیری سادھ پر آیا ہوں۔ جند کی چٹکیری چھاؤں موت کی آواز بن کر کہتی ہے میں مے ہوں سے انسان کا سادھ عارضی پیار نہیں کرتی۔ تم کہتا ہے گوری ایک دفعہ تو جی لے۔ میں نے رنڈ دے ہو کر بہت دکھ پایا ہے۔

اس کے بعد تم لے میرے جوتوں کی سلائی چھڑوی۔ اپنی بگڑی سے تپو اتارا اور اس سے اپنی آنکھیں پر بچھنے لگا۔ جذبات کی رویں میری آنکھیں بھی ہنناک ہو گئی تھیں۔ اس وقت میں گیت کی افسانوی قیمت پر غور کر رہا تھا تم نے ایک ایسی

گرہن

بات بتاتی جو انسانی نفرت پر ایک طنز تھی۔ وہ یہ کہ جب اس کی بیوی دلسن بن کر آئی تو تم اس کی جوانی اور خوبصورتی کی بے طرح ہاس ہانی کرنے لگا۔ وہ اسے وردانے میں بھی اکھڑی دیکھنا تو بیٹھنے لگا۔ یہ شک و شبہ کی عادت ابھی تک باقی تھی۔ اس وقت جبکہ گوری کا جسم توانا اور بھرا ہوا تھا وہ اسے کتار ہا۔ مجھے ایک تپلی، نازک عورت پسند ہے اور جب وہ دُہلی ہو گئی تو کہنے لگا۔ مجھے تم سی مرلی عورتوں سے سخت نفرت ہے۔ یہ ان ہی دنوں کی بات تھی جب وہ کتوں والا واقعہ پیش آیا تھا۔

سوچی کی ان سب باتوں سے میں نے یہی اخذ کیا کہ گوری آخر کیسے جا کر مر گئی ہوگی۔ آخر تم کے اناجہذا باقی ہو جانے کا کیا سبب؟ اس وقت مجھے وہ کہانی نامکمل سی رکھائی دی اور میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”پھر اس کے بعد کیا ہوا۔۔۔“ تم نے نیت تو ختم ہی نہیں کی۔“

تم بولا۔ ”اس تین پاو ماہ کے عرصے میں ادھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ وہ پہلے ہی بہت بیمار تھی، مر گئی ہوگی۔“ سناتان پور دیاں سے تین چار سو کوکس وور پورب دیس میں ہے۔ ایتا تھوک ڈاک خانہ لگتا ہے۔ میں وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ میرے پاس کرایہ تک نہیں ہے۔ میرے غصیلے پن کے سبھی نالاں ہیں۔ کوئی مجھے مانگے کی ایک کوڑی بھی تو نہیں دے ہے۔ یہاں شراب کی کچھ بوتلیں پڑی ہیں اور بس۔ بابو جی میری نو آہل ہے۔ میں ایک دفعہ وہاں افسوس کرنے کے لئے تو چلا جاؤں!“

لیکن تم کادہ خیال خام تھا۔ اس چمڑے کی طرح خام حواس نے بانوں باتوں میں میرے بوٹکے نیچے لگا دیا تھا اور جو ایک ہی جیسے میں ٹھس گیا۔ اس ایک جیسے

کے اندر تم ایک دن میرے پاس بھاگتا ہوا آیا۔ میں اس وقت چوبارے کے چھجے پر بیٹھا لکھنے کے چھجے پر ٹانگیں لٹکاتے پڑھنے کی بجائے کتاب کے درق الٹ رہا تھا۔ تم نے ایک ہاتھ اوٹھایا کیا۔

مخط ہے ————— بالوجی ایک خط ہے " وہ کہہ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے چوبارے پر سے اتر کر خط پڑھا۔ سنتان پورے آیا تھا تم کو ایک دو غفلتوں کی سمجھ نہ آتی تھی۔ اس خط میں گوری کے متعلق لکھا تھا۔ وہ محض چھاپہ کے استعمال سے مندرست ہو گئی تھی۔ اور جہتی کے بعد دس آدھ ہی گنیش جہتی کا پانچو کہنے سے کوئی الزام لگ جاتا ہے۔ خود کو رشن ہمارا راج جنوں نے کسی جانور کے گھر سے بنے ہوئے گڑھے میں بھرے ہوئے پانی کے اندر چاند کا عکس دیکھ لیا تھا۔ تھمت سے نہ بچے۔ اس جہتی کو گزار کر آنا ضروری تھا۔

خدا بے کار آدمی کو کام دے! میں ان دنوں اپنے چوبارے میں بیٹھا تم کی فیکٹری کے ٹوٹے ہوئے روٹن دانوں میں سے تم کی سب حرکات دیکھا کرتا۔ جب اس کے ساتھ کام کرنے والے کارگر پہلے جلتے تو تم ایک کھونٹی پر چلے ہوئے چلے کو اتار لیتا۔ اور بڑے اجڑا اور وحشیانہ انداز سے اسے پیار کرنے لگتا۔ جیسے کوئی نئی سی لڑکی گڑیا سے کہیں رہی ہو اور اپنے گرو ویش سے بے خبر اس بے جان گڑیا سے ہزاروں بے معنی باتیں کر لیتی ہو۔ چٹلے کے علاوہ گوری کوئی میلا کچلا دوپٹہ لگنی پر بھول گئی تھی تم اسے اتار کر اپنی تھپائی کے ساتھ بھینپنے لگتا، بیوی اور اس کے بعد اس کا چھلا، اور پھر دوپٹہ، اور چند پوسے تم کی مدد و کسانات تھی غصیل اور رومال ہونے کی وجہ سے کوئی اس کے پاس تک نہیں بچھٹکتا تھا۔ گوری نے میکے جا کو اسے

گرمی

خوب ہی سزا دی اور اپنی بیماری کا کیا ہل علاج دریافت کر لیا۔ چھا چھا! میں سوچنے لگا۔ اب تم نے گوری کی قدر پہچانی ہوگی۔ اور جب دوسپرتی کے بعد واپس آہائے گی۔ تو وہ اس کی پوجا کیا کرے گا۔ اس وقت دھوپ کی معتدل حرارت میں مجھے کچھ غنیمت سی آنے لگی اور میں گوری کے گیت کے متعلق سوچتا ہوا اونگھنے لگا۔ اس وقت ایک خیال میرے دماغ میں آیا ————— جیسے جی انسان کی ہڈیاں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد پھول ہو جاتے ہیں۔

سپرتی کے تیسرے روز تم کی بیوی کو آنا تھا۔ اس دن تم نے فیکٹری کے تمام مزدوروں کو چھٹی دے کر اپنے اہتمام میں اور جلد بازی کا ثبوت دیا۔ وہ خود تمام دن گاؤں کے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ اس دن تم نے ریز کے نشے میں سے آدھ سیر جلیبیوں کی گنجائش نکال اور ایک آب خورد سے میں آدھ سیر دودھ لاکر چار پائی کے نیچے رکھ دیا اور آبی کے ڈرے موری کے منہ پر چھوٹی چھوٹی انہیں لگا دیں۔

گذشتہ دنوں میں ڈونڈر محلہ کے چھوکرے دن اور کالی باڑی کے سپر جیوں، کچھروں اور باسوؤں کے لڑکوں کی لگیاں اور گینڈ ٹوٹے ہوئے روشن دان سے تم کی فیکٹری میں سہاڑے تھے۔ چھوکرے نے ڈرے انہیں مانگنے کی جرأت ہی نہ کی تھی۔ اکیلا تم ہی اپنی گوری کے آنے کا منتظر نہیں تھا۔ وہ بچے بھی اس کا انتظار کر رہے تھے اور کچھ علم کے گھر کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ کب وہ آئے گی اور لگی وے گی۔ بڑوس کے نابینا استاد کی لڑکی شریا کئی دفعہ پرچہ پکٹی تھی۔ "خالی کب آئے گی؟" گوری کا پڑوس کی سب عورتوں سے میل جول تھا۔ دو شریا کا سرو مکھ دیا کرتی تھی جس میں بار سال لیکھیں

پڑ گئی مٹینس۔ فیکٹری کی مشین کی جانب جو لاپر شاہ کا گھر تھا۔ وہ ایک بار ایک دن کے نوٹس پر تبدیل ہوا تھا تو کم کی بیوی نے ایک دن میں اس کے تین درجن کے ستریب کپڑے وصول کر لئے تھے۔ یہ سب کے سب چترتی سے میسرے روز کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ بار بار گوری کے متعلق پوچھتے تو تم کو اپنی ناقبولیت کے مقابلے پر گوری کی مقبولیت کا احساس ہوتا کبھی کبھی وہ سوچتا۔ شاید یہ سب کچھ گوری کی خوب صورتی کی وجہ سے ہو گا۔ عورتیں بھی تو عورتوں پر عاشق ہو جاتی ہیں، اس کی سہیلیاں بن جاتی ہیں اور اس کے ارد گرد منڈلاتی ہیں۔ پھر اس میں حسد و رقابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور سب کبھی کوئی نوجوان پڑوسی اس کے گھر کے متعلق بات کرتا تو تم نہایت شک و شبہ کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا۔ اسی لئے میں نے گوری کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کو اور اشت سے احتیاطاً خارج کر دیا تھا۔ حالانکہ مجھے بھی خواہش تھی کہ میرے چوہارے کے سامنے تھوڑی سی رونق ہو جائے اور اس سوئی فیکٹری کے اندر سے ایک نئی سی خوب صورت آواز آیا کرے۔ ایک دم سے پھول سا چہرہ دکھائی دے اور چھپ جائے۔ گوری کے چلنے جانے کے بعد مدت تک میں اس غلام کو ٹکس کو تار ہا تھا۔ اس حالت میں یہ کمی تم کو کیسے نہ اگھرتی ہوگی۔ تم کو جس کی گوری اپنی ملکیت تھی اور جسے اس پر بجا غرور تھا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر کراچ۔ شاید پہلی دفعہ تم میں جو چیز اپن چھوڑ دینے اور کسی سے میل ملاپ رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بچوں کی گھبیاں اور گیندا اٹھائے اور میدان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دے دیے۔ پھر اس نے ثریا کو بلایا۔ اس کے ساتھ درمیان اور چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی تھیں۔ تم نے جیب میں سے اکتی نکالی اور اسے ثریا کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بڑا گائیڈنس سے بولا:

گرم

”یہ خرچ کر لو، لیکن دیکھو میٹا! —————“ تیل کی چیز
مت کھانا۔“

اس تیل کی چیز مت کھانا“ میں زندگی، ابھی زندگی اور اس کی متعلقہ رجائیت
سے ایک غیر مشروط صلح کا جذبہ ظاہر تھا۔ اس دن تم اسٹیشن پر بیوی کو لینے گیا اور جب
شام کو واپس آیا تو اس کے ساتھ کوئی عورت نہ تھی۔ وہ یہاں ہی منعموم اور اس واپس چلا آ
رہا تھا۔ بھٹان پور سے آنے والی گاڑی میں اس کی بیوی نہیں آئی تھی۔

اس دن تم نے بچے ہوئے پیسوں سے شراب منگوائی اور خوب پی اور گڑھی
کے کھلتے ہوئے پیسوں کو لپیٹ لپیٹ کر گندی گندیاں لگایاں دیتا رہا۔ شام کے قریب
اس نے دوپٹے کو اتارا۔ اور اسے آنکھوں سے لگا کر رونے لگا۔ پھر خود بخود اس
کی ڈھارس سی بندھی اس کے باوجود کہ وہ نئے میں تھا اور وہ دیوانے کتے کی طرح
منہ میں کھٹ پیدا کتے ادب سے ادب اور ادب سے ادب گھومنے لگا۔ کبھی کبھی چٹے کر
اتار کر پوم بھی لیتا مجھے ان روشن دانوں میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے
کمرے کے ساتھ رہنے والے ٹیبلین کو بھی تم کی حرکات دکھائیں۔

رات کے نو بجے سے نو بجے کا وقت تھا۔ میں اور ٹیبلین جھجھے پر کھڑے تم
کو دیکھ رہے تھے۔ میٹی کے تیل کے لمپ کی روشنی میں تم نے ہمارے دیکھتے دیکھتے
سب کپڑے اتار دیئے اور ننگا کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہیں سے اپنی بیوی کی سرخ
مدری برآمد کی۔ اور اس چارپائی پر جس کے نیچے شراب کی خالی بوتلیں اور ڈھکنے پڑے
رہتے تھے۔ وہ اکیلی مدری بہن کر سو گئی۔

اس کے بعد ایک اور خط آیا جس میں تم کی بیوی نے اپنے نہ پہننے کی وجہ

بتائی تھی کہیں سہرتی کے روز بھولے سے اس دہی عورت کی نظر جان پر پڑ گئی تھی۔ اور اب وہ اُپائے کروا رہی تھی۔

خط میں اور باتوں کے علاوہ سفنان پور سے واپسی کی مقرر تاریخ بھی لکھی تھی۔ اس دن حسب دستور ثریا اور دوسرے بچے پوچھنے کے لئے آئے اور ہم نے قصداً اس بات کا تذکرہ نہ کیا۔ اس دن محل پور کے اسٹیشن پر سے کسی لیڈر کو گزرنا تھا۔ اس لئے میں اور لین نے بھی اسٹیشن جانے کا ارادہ کر لیا۔

تم نے اس دن بھی حسب معمول فیکٹری کے کاریگروں کو چھٹی دسے دی اور کب خیرے میں دو دو گھنٹوں کا رکھا۔ کاریگر بھی تم کے اس اضطراب اور اس کی بیوی کے آنے پر نہ آنے کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنستے تھے اور ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے تھے۔

شام کے جمعہ پٹے میں تم اسٹیشن کی طرف روانہ ہو۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ اسٹیشن قصبے سے پون میل کے قریب تھا اور ابھی اتنی روشنی تھی کہ ریلستے میں شاہ جی کے باغ کے سنگترے اور ان کا نارنجی رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ تین چار آدمے جانور باڑھ کو توڑ کر باغ کے اندر داخل ہو رہے تھے اور ہمارے سامنے کوئی سو گز کے فاصلے پر تم سر راہ سنگریزوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا اپنی دامن میں جبا جبا رہا تھا۔ اس نے سر پر ایک سرخ بنارس صاف باندھ رکھا تھا کبھی تم گرو عمار میں ہنساری نظروں سے غائب ہو جاتا اور کبھی پھر کس کا بنارس صاف دامن کے کچیرا ہوا ہتھاری نظروں میں کھینے لگتا۔

اس دن اسٹیشن پر بھیڑ تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد ہم اڑی آئی۔ اس کے بسط میں ایک زمانہ ڈوبنا اور عورتوں کے جوم میں دوختس سہمی ہوئی آنکھیں ٹکڑی

کے احساس سے پیٹ خام پر گھومنے والے خوب صورت سے خوب صورت، متمول سے متمول آدمیوں کے گروہ میں ایک بد صورت، تلاش اور چڑچڑے آدمی کی جہان تھیں۔
تم تم آہستہ آہستہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا گوری کی صحت پہلے کی نسبت بہت اچھی ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ شگفتہ چہلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔
بے سفر کی وجہ سے تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھیں چار ہونے پر وہ بے صبری کی کیفیت زدہ ہی یا شاید وہ اپنی کمزوری کو غلام کرنا نہیں چاہتا تھا۔

تم نے وہ ایک میلے پھیلے کپڑوں کی گٹھڑیاں، گنوں کی ایک پولی، اور چند اور چیزیں اتاریں اور اس کے بعد گوری بھی نیچے اتر آئی۔

چلتے چلتے بھیڑ میں گوری کسی کے ساتھ بھڑکنے لگی۔ تم نے اس واقعے کو دیکھا۔ اس کے علاوہ پل کی میز جیوں پر چند ایک بے کار نوجوان کھڑے گوری کو دیکھ رہے تھے۔ جو ایک خاص قسم کی کیفیت میں انڈی سی چل رہی تھی۔ تم نے غصے سے پیچھے دیکھا اور بولا:

”گوری —“

گوری نے کانپ کر ادبیر اوپر دیکھا اور گھونٹ سر پر ڈال لیا۔
اب اسے راستہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ تم کے دھوکے میں اس نے اپنا ہاتھ کسی اور شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔ یا شاید یہ چتر ترقی کے چاند دیکھ لینے کی وجہ سے تھا کہ تم نے غصے سے ہلکاتے ہوئے کہا:

”یہ نئے ڈھنگ سیکھ آئی ہو — پھر آگئیں“

گھر

میری جان کو دکھ دینے۔“

..... اس وقت پل کے پاس، ایک
مریں ساکتا ایک خوب صورت کتیا کے سامنے اظہار محبت
میں دم ہلا رہا تھا!

زین العابدین

MEHRAN LIBRARY
B-61 Bhangorwa Town
Azizabad Karachi
TIME 6 to 10 pm

اونگھ جانے کے عزم بہت کم، سگریٹ کا دھوکہ، میری انگلیوں میں بے ارادہ تھا،

جلا کیا..... جلا کیا.....

اونگھنے کے عمل میں ہونجائے کا پہلو ہوتا ہے میں اس سے پوری طرح غفلت اندوز
ہونا چاہتا تھا۔ بیداری کی تلخ حقیقتوں کو کس طرح انسان خواب کے حسین بطلان میں
کھوئے چلا جاتا ہے..... ایک دم سگریٹ کے بھپو نے مجھے دوا انگلیوں کے
وریدان کا نام اپنی جگہ سے اچھل پڑا، سگریٹ نے ایک لمبی جست لی اور چٹائی پر گر کر
سگنے لگا۔ اسے پاؤں سے خاموش کرتے ہوئے میں نے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو ہاتھ
سے چھوا۔ چائے شربت ہو چکی تھی اور نیوہا گلیسرین کا خوبصورت، ایرانی نژاد چھوکر
اور دیکھتے ہوئے کو تلخ، پاس پاس پڑے ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہوئے

سوتے سوتے، سو ہی گئے تھے۔

سرد خون والے جانور مثلاً سکھوں کے عہد حکومت کی بنی ہوئی ہماری کوٹھڑی کی ٹوٹی پھوٹی چھت کے پیچھے بنے والے سفنجی کیرے، ہزار پانچھپلیاں اور ان کے رنگینے والے بجائی منجمد ہو چکے تھے۔ خون کا دودھ ان کی رگوں میں کست پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے خوراک کے لئے بھی جلد جلد چھوڑ دی تھی۔ وہ عیار چھپکلی جو ہر دزد بے پاؤں دشمنی کے گرد طواف کرنے والے پروانوں کا شکار کرنے آیا کرتی تھی اس روز نہ آئی اور جھینگہ دن نے بھی تو سر شام ہی شور مچایا تھا جبکہ موسیٰ کی آخری شعاعوں کی گلابی گرمی کو سردی تسخیر کر رہی تھی سردیوں کے شروع میں میدان میں اتر آنے والی ابابیل جس نے ریٹور ان کے کھلاک کے پیچھے اپنا گھونسل بنا رکھا تھا، پر پھر پھڑکڑا کر اپنے بچوں کو ان میں لپیٹے ہوئے، ان کی حرارت کو سرف ہونے سے بچا رہی تھی۔

اس وقت میں بہت سے نرم و گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا اور میری تلخ یادداشت پر فراموشی کا اعلیٰ تبخیر شروع تھا۔ اچانک سگریٹ نے مجھے جگا دیا اور آنکھیں کھلتے ہی میری نظر چھت پر ایک بے قاعدہ دائرہ بناتی ہوئی اچار پائی کے نیچے دو سسے ہوئے پیروں پر جا پڑی۔ کچھ دیر گھوگی حالت میں، میں ان پیروں کو گھورتا رہا۔ پھر یکایک کسی خیال کے آنے سے میں نے ان پیروں کو چھو دیا۔ چھو تو اسی نہیں بلکہ زور سے کھینچا اور چلا آیا۔

”زینو کے بچے...؟“

زینو، ان پیروں کا نام، ایک تیس سالہ ننگ پیری نوجوان، سفنجی کیرے کی

طرح سکڑ گیا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اب وہ چھپ نہ سکے گا اپنی کمنیوں کی مدد سے بچھے کو سرکار، اگر وہ جھٹلا، بالوں کو جھٹکے سے سیدھا کیا اور بے حیاءوں کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے نظریں پراتے کی بجائے اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے اسے کان سے پکڑا اور کھینچتا ہوا میپ کے پاس لے گیا بالکل اسی طرح جیسے وہ عیار چھپا کر کسی بڑے سے پروانے کو پکڑ کر روشنی کی طرف بڑھتی تھی۔

زینو کی آنکھیں آج معمول سے زیادہ خونی ہو رہی تھیں۔ بال بھی پہلے سے زیادہ منتشر تھے اور نچلا ہونٹ نلک کر پان نورود، دانتوں کی سیاہی کو نمایاں طور پر دکھا رہا تھا۔ اس کے زرد، ڈبلے، آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں اور اس کے چوری کے ہر روز بڑھتے ہوئے تجربے کو میاں کر رہی تھیں۔ شاید زینو چوری کے ذریعے اپنی آمدنی کو خرچ کے برابر کرنا چاہتا تھا۔ چوری کے روپے آمدنی کو خرچ کے مساوی ہی نہیں کرتے، بڑھا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کے خدو خال کو نہیں بھرتے اور شاید اسی لئے چوری کا سائیک اور منفعت پیشہ بڑا ہے۔ میں نے قدرے سختی سے کال کو کھینچا اور مجھے یاد آیا کہ زینو کی اپنی ہوئی تھیں میری اپنی ہے، یہی جو میں نے چند دنوں کے لئے اسے پہننے کو دی تھی۔ گرفت کو دھبلا کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”کیوں بے اسالے، بد معاش، بولتا کیوں نہیں؟ کیا چور ہوا تھا یاں؟“
 ”میں یونی پڑا تھا، میں سوتے سوتے چار پائی سے گر پڑا تھا، میں چار پائی کے نیچے آپ کے لال امل کیل کو ڈھونڈ رہا تھا۔“ وہی پشٹا ہوا کیل جو آپ نے مجھ کو کھینک دیا ہے ادھی، وہی جس میں جوئیں چل گئی تھیں، یاد نہیں آپ کو؟

ہاں ہاں وہی! — اور اس قسم کی یادہ گوئی کی بجائے اس نے اپنے سر کو جھنجھوڑا اور دو ٹوک جواب دیا۔

”چوری!“

اس مختصر، جامع، نفیاتی آزما جواب نے مجھے چند لمحوں کے لئے خاموش کر دیا اور میں ایک ایسی دنیا میں اڑنے لگا، جہاں ایمان، شرافت، ایک اخلاقی بات ہو جاتی ہے اور ٹھوڑے سے بھرنیے سے دیانت داری اور چوری میں کانٹوں کو ہاتھ لگانے اور تفاوت رہ مست کھاتا کہ دالی بات نہیں رہ جاتی۔ اس پر نجات خاموشی کے عالم میں میں نے اپنے آپ سے سوال کیا: ”علا“ اپنی مذموم عادت سے باز نہ آئے گا؟ کئی مرتبہ اسے چوری کے الزام میں قرار واقعی سزا دی جا چکی ہے۔ . . . جس طرح نیلے رنگ لکاشیشہ سفید روشنی کے باقی چھ رنگوں کو جذب کرتے ہوئے نیلے رنگ ہی کو گذرنے کی اجازت دیتا ہے، اسی طرح اس کی ذہنیت بھی سب اچھی باتوں کو جذب کرتے ہوئے چوری کی طرف آزادانہ رجوع کرتی ہے!

”تم نے خان کا سوٹ کیس کھولا ہے؟“ میں نے اسے آستین سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”ہاں!“

”اگر تان دیکھ لے تو؟“

”نہ تو کانپ رہا تھا، خوف سے نہیں، سروی سے،“ اور بولا: ”دیکھ لے تو پکڑ لے!“ اسی طرح آستین سے یا اگر بیان سے، جیسے آپ نے مجھے پکڑ رکھا ہے اور نہیں چھوڑتے، وہ بھی نہ چھوڑتا تو کیا بگاڑ لیتا میرا۔ . . . 4۹۰۰

گھوم

میری بات کے جواب میں زینور بھی کہہ سکتا تھا، آپ ہی کی قمیص بچھڑ جاتی نا..... میرا کیا بگڑ جاتا؟ اور یوں دریدہ و مٹی کے علاوہ ایک لطیفہ ہو جاتا۔ لیکن اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ کیا کسی لطیفے سے کم تھا؟ میں نے مرعوب ہوتے بچنے اس کی آستین کو چھوڑ دیا۔ سپر کو اپنے گرو لیڈا، مین بسند کئے اور اس کے کندھے کو تھپکتے لبوں سے ایک برسے کی آواز پیدا کرتے ہوتے کہا۔

”شاباش! اللہ تمہارے نیک ارادوں میں برکت دے، بیٹا!“
اور پھر بیٹھے ہوتے میں نے غصے سے کہا ”جسٹیل خانے کی ہوا اس آئے گی تمہیں، اُو کے پیٹھے!“

اسی وقت زینور نے انگلیوں کی کنگمی بنائی، اپنے منتشر بال درست کئے اور اپنے گھٹنوں سے مٹی جھاڑی میری بات کے جواب میں وہ تھکے دلیری سے بولا۔

”آپ کے خیال میں جیل کی زندگی اس زندگی سے بُری ہے؟ دہاں بھی اللہ روٹی دے، اللہ سب کا رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین.....“

میں نے دل میں سوچا، عجیب ہے اللہ! اور پھر میں نے کہنا چاہا۔ اللہ میرا بھی تو رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین مجھ پر بھی تو عائد ہوتا ہے اور بہتر طور پر، اس خانہ پر جس کا سوٹ کیس تم نے ابھی ابھی ناپاک ارادے سے کھولا ہے۔

..... اور پھر زینور خود ہی چپ چاپ ڈیٹ مار کی خالی پیٹی پوٹھیہ گیا۔

شاید وہ اندھیرے میں میٹھ کر اپنی ندامت کو چھپانا چاہتا تھا۔ میں سپر اور جو توں کیت بستر میں جا گھسا اور ایک کونے سے اسے دیکھنے لگا۔ زینور، ایت بے پروائی سے بیٹھا اپنے دانتوں کی تیل کو دیر با تھا۔ پھر اس نے احتیاط سے قمیص اتاری جس نے

گوشت

اطمینان کا سانس لیا اور سوچا، زینو کو کچھ بھی کہنا بے فائدہ ہے۔ لامحالہ میں نے اسے سلوک گم کرنے کو کہا اور خود اٹھ کر خان کا سوٹ کیس بند کرنے لگا۔ اس وقت خان نے چادر پانی پر چلو بدلا، چادر پانی تجھی اور میں نے کانپ کر سوٹ کیس پر سے اٹھ اٹھائیں۔ خان اپنے پیسے سے لحاف میں سر گم گیا: شاید خون کا دودھ اس کی رگوں میں بھی سست ہو چکا تھا۔

زینو کا پورا نام زین العابدین تھا۔ عابدوں کی زینت۔ لیکن سوری عجب قسم کی عبادت ہے جس کی تلقین ہماری مذہبی کتابوں میں شاید غلطی سے روکتی ہے۔ اگر ہمارا معبود حق تعالیٰ اور زبردستی کو دیکھ کر بھی جامد رہتا ہے، اپنی تعریف سے بھی شرمسے مس نہیں ہوتا یا رد کوئی بڑا چور ہے تو زینو نام بھسمی تھا۔

حقیقت میں زینو کا کوئی خاص نام نہ تھا، فیض اس نے کہ سب اس سے واقف محبت کرتے تھے۔ محبت جو نفرت کے بعد پیدا ہوتی ہے جس میں بذات کو دخل ہوتا ہے اور اک کو نہیں۔ زینو کا نام وقت اور جگہ کی مناسبت سے رکھ لیا جاتا تھا۔ اس قتل نام کے نہ ہونے کا زینو کو گلہ تھا۔ لیکن شاید نہیں۔ زینو میں خد کسی چیز کی نہ تھی۔ وہ کھٹکھٹا کر نہستا اور نہ گڑگڑا کر روتا۔ اس کے رونے اور ہنسنے میں تمیز مشکل سے ہوتی تھی۔ والدین شاید زینو کو بڑا دلیر اور اس قسم کے مشکل ناموں سے پکارتے ہوں گے بچاتے اس کے کہ حرامی یا ایسے ہی کسی انسان نام سے پکارتے۔ کوٹھڑی میں بسنے والے یارانِ طریقت سب کے سب زینو کے گرد دیدہ تھے۔ اس لئے وہ اسے ہر دفعہ اپنے من مانے نام سے پکارتے، خان اور

وحید اسے دیکھا کہہ کر جاتے تھے شریفین کا تب اسے سالانہ کہا کرتا تھا اور زینو جب سالے کے نام پر لیبیک کہتا تو شریفین کی ایک خاص قسم کی خوشی ہوتی۔ دو خوشی جو لگتی یا میٹھی میٹھی خاکشش کے مشابہ ہوتی ہے اور عموماً ایسے رشتوں سے ہی حصے میں آتی ہے۔ کوئی بڑے غم خود باپ تھا اور کوئی بیٹوئی، اور اس طرح بغیر کسی عورت کے دو تان ایک بڑا سا کنبہ پس رہا تھا۔

ہماری گولٹری میں ایک نو مسلم راجپوت رہتا تھا۔ خان اسے تکلف سے ہمدی اسلام کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اس شخص کا پیشہ نقلی چیزوں پر پینٹ کے لیل چسپاں کر کے بیچنا تھا۔ ہمدی اسلام نو مسلم ہونے کی وجہ سے بہت پارسا اور نمازی تھا اور چونکہ خود تجر پسند تھا۔ اس نے زینو کو سالے کی بجائے ماموں کہہ دیا کرتا تھا۔

زینو کی مجھ سے پہلی ملاقات ایک سادھے کی نوعیت رکھتی تھی۔ چلی بختہ کے تاریخی بلوے میں میں بیں مجروح ہو کر ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں میرے ساتھ زینو کی چار پائی تھی۔ اسے غائب پوری کے الزام میں پٹیا گیا تھا۔ اس کا ہرہ خاک اور دھول میں اٹا پڑا تھا۔ ان میں سے دو انگلیں باہر ٹھوڑی تھیں۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی جیب میں دو دانت تھے جو اس نے نہایت احتیاط سے سنبھال کر رکھے تھے غالباً انہی دانتوں کے سلسلے میں اس نے مجھے بلایا اور پوچھا۔

”آپ کیا کام کرتے ہیں؟“

”دارالترجمہ میں نوکر ہوں“ میں نے کہا۔

”کیا نوکری ہے؟“

”دبیر اول“

گرمی

”دیر اول کیا ہوتا ہے؟“

”ہیڈ کلرک — بڑا کلرک، فٹشی، بڑا فٹشی، بڑا بابو“ میں نے
ذرا وضاحت سے کہا۔

زینو جو اس وقت بیٹھا ہوا تھا مایکس سا ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس وقت
دونوں دانت اس کے انگوٹھوں میں تھمے ہوئے تھے جنہیں وہ بھمے دکھانا چاہتا تھا۔
دو جہانی لیتے ہوئے بولا:

”میں نے سمجھا آپ ضلع کچہری میں چہر اسی ہیں“
میں نے اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے کہا: ”آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟“
”آپ کی شکل سے“ اس نے بلاتامل کہا۔

میں نے نچل ہو کر سر کو گرا لیا۔ دانت برآمد کرتے ہوئے زینو ایک اذدارانہ لہجے
میں بولا: ”ان حرامزادوں نے میرے دو دانت توڑ دیئے ہیں، اب بھلا یہ دودھ کے دانت
تھوڑے ہیں جنہیں سورج کی طرف پھینک دیا جائے گا اور وہ پھر سے پیدا ہو جائیں گے
کیا آپ کا کوئی بخیل (وکیل) واقف ہے جو لاش کی کچہری (مائی کورٹ) تک پہنچتا
ہو؟ میں نے سنا ہے دانت توڑنا سرکار میں بڑا جرم ہے۔ دانت توڑنے والے سے
پچاس روپے جرمانہ (جرمانہ) وصول کر کے دانت کے مالک کو دیا جاتا ہے۔ اب
میرے پاس مقدمے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ آپ مقدمہ کر کے ان دودھ اتوں کا سو
روپیہ لے لیں، اور میں مجھے دے دیں، مجھے بڑی ضرورت ہے۔“

”بھلا اس سے زیادہ نفع بخش سودا اور کیا ہوگا؟ میں نے سوچا اور پھر زینو سے
مجھ زیادہ گہرے رازدارانہ لہجے میں نہیں نے کہا: ”صوبہ — شاید تمہیں دو سو

مل جائیں۔ ان دانتوں کو نیلام گھر میں بیچا دو۔

اس وقت زینو تقریباً اسی عمر ہوا تھا۔ میں نے اسے پیسوں پہنچا دیے اور اسے اور خوب صورت عورتوں کی تصویریں دکھا کر اس کے ذہن میں مٹتے ہوئے یقین کو جلا دی۔ میری رفاقت میں وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔ میں نے اس سے بھی ایک قدم آگے اٹھایا۔ زینو جو کہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ اس کی بے کسی کا احساس کرتے ہوئے، یا دوسرے لفظوں میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ لیکن اس نے اتنے ہی گونا گوں مصیبتوں میں مجھے مبتلا کر دیا۔ بارہا میں سوچتا ہوں میں نے کیا بڑا کیا ہوا ایک بازاری کتے کی طرح ارزاں، ایک کیرے کی طرح بے قیمت انسان کو تعزیرات سے اٹھایا اور اپنی کوتاہی میں جسے والے شریف زادوں کا نزدیکی بنا دیا۔ پھر میرا ذہن خود ہی جواب دیتا ہے۔ تمہارا ہی تو سب تصور ہے کہ تم نے ایک کیرے کی استین میں رکھا، کیرے کی صبح جگ گندگی ہے۔

پھر خیال پیدا ہوا اس نیک کام گے کرنے میں جذبات نے تمہیں کتنا حظ دیا ہو گا جسے تم روحانی حفظ کہتے ہو۔ اس تھوڑے سے حظ کی تمہیں قیمت دینا ہوگی جذبات! — جذبات ہمیشہ آدمی کو خرد لے منگے پڑتے ہیں لیکن اگر کوئی میرے بہت ہی قریب ہو کر پوچھے کیا تم دیر پا خود پسند کر دگے یا وقتی جذبات کو تو میں بلا تامل کہوں گا — جذبات کرا

ماوت! میں مگر پتے پتے اٹکھ جاتا ہوں اور جب انگلی

گرہن

جلتی ہے تو چونک اٹھتا ہوں۔ ایک دن کسی مترجم کی وفات پر دارالترجمہ میں چھٹی
مٹی اود میں دوپہر ہی کو اپنی گھر ڈی کی چھت پر دھوپ میں پڑا اونگھ رہا تھا۔
میرے ہاتھ میں بکسٹور سگریٹ تھا جبکہ نیو جہانگیر ریٹوران کے ایرانی نژاد چھوکرے
نے پکیدان لا کر میرے پاؤں میں رکھا۔ ابھی سگریٹ نے میرا ہاتھ بھی نہ بلایا تھا
کہ سیرھیون پر دھما دھم کی آوازیں سنائی دیں۔ میں جاگ اٹھا۔

خان، وحید، ہندی اسلام، ریٹوران کا منجرب کے سب میرے سامنے
کھڑے تھے اور چیخ چیخ کر میرے دماغ میں گھسا چاہتے تھے۔
”میری گھر ڈی لے گیا ہے سالار“ شریف نے کہا۔

”اور میری شہدائی“ خان آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔

ریٹوران کا منجرب کہنے لگا: ”تین روپے سات آنے کا بل دو ماہ سے واجب الادا

ہے۔“

سب سے آخر میں ہندی اسلام بولا۔

”میرے پانچ ارٹائلے ہیں مال کے خاوند نے۔۔۔۔۔“

ہندی نے دو گالی ذرا وضاحت سے نروئی تھی۔ میں نے سوچا شاید ہندی

نے ماموں بھائی کے کاشتہ بدل دیا ہے اور اسے مال کا خاوند بنالیا ہے۔ یہ سب
رشتہ عجیب ہے۔ آخر یہ پارسا اور نمازی لوگ گالی دینے کے لطیف فن میں ماہر
کیوں نہیں ہوتے۔ معمولی سی وضاحت لفظ اپنی مکے افسانے سے ایک جامع گالی
ہو جاتی۔ خیر! میں نے سب کو فرادہ سمجھایا۔ وہ آہستہ اپنے نقصان کی قدرتی مجھ
سے چاہتے تھے۔ کیونکہ میں نے ہی انہیں وہاں لا کر رکھا تھا اور زمین کی سب حرکتوں

گرمی

کے ٹٹے میں ہی ذمے دار تھا۔ یہ کیا کم رعایت تھی کہ زینو سے کرایہ نہیں لیا جاتا تھا اور اسے دارالامان (بیماری کو ٹھہری کا نام) میں پناہ دی جاتی تھی؟ شاید وہ سب لوگ مجھ سے بہت نامناسب سلوک کرتے اور لڑائی کی صورت میں تو شاید ایک ایک سو دو ہڑیاں ہی ان کے حصے آتیں لیکن میں نے غامض ہنستے ہوئے کہا کہ اگر زینو شام تک نہ لوٹا تو میں کیم کو سب کا نقصان چکا دوں گا۔ ان سب کو کیم کی بندش پر اعتراض تھا۔ میں نے وہ اصل سوچ رکھا تھا کہ بالغرض زینو شام تک نہ آئے تو بھی کیم میں جمعہ جمعہ آٹھ ————— پورے آٹھ دن پڑے ہیں۔ اور میرے رفیق مجھے کم از کم اتنی رعایت تو دے سکتے ہیں کہ زینو کے کیم سے پہلے آجائے پر مجھے چھوڑ دیں۔

اس کے بعد میں ”ژمانا داول“ دیکھنے کے لئے سینما چلا گیا۔ جب رات کے دس بجے لوگاتو میں نے دیکھا کہ خان کی لنگی کھنٹی پر ٹنگی تھی اور شیشم کی تپائی پر شریف کی گھوڑی رات کے سناٹے میں ٹپ ٹپ کر رہی تھی۔ کونے میں میرے موٹی کے بوٹ رکھے تھے جو میں نے چند دن ہوتے بالکل نئے خریدے تھے اور انہیں ابھی تک گھس جانے کے خوف سے نہیں پہنا تھا اور اپنے پرانے جوتوں کو لگاتار استعمال کرتا رہا تھا۔ اب وہ وہاں کچھ دیر لت پت پڑے تھے اور اڑوٹھ کی طرح منہ پھاڑے ہوئے تھے۔ غالباً زینو انہیں بھی پہن گیا تھا جس کا مجھے علم ابھی تک نہ ہوا تھا۔ اپنے بوٹوں کے یوں خواب ہو جانے پر میں بہت خشمگین ہوا۔ میں نے وحید سے کہا: ”وحید! اس کا مطلب ہے زینو آچکا ہے واپس؟“ وحید نے ایک پرانی سی جینٹری جس کی وہ ورتل گروائی کر رہا تھا نیچے پٹخ دی اور کونے میں بیٹی کی طرف اشارہ کیا۔

گرمی

کونے میں زینو بیٹھا تھا۔ اس کے بال کبھرے ہوئے تھے۔ چہرہ مٹی سے اُپڑا تھا اور اس کے نیچے کالب بری طرح ٹک رہا تھا۔ میں نے اس وقت بھانپ لیا کہ تعلقداروں نے مل کر اسے بڑی طرح سے بیٹھا ہے۔ آج میں بھی اس بوسمین کو پیٹنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے میرے سوئیڈ کے بوٹوں کا ستیا ناکس کروایا تھا۔ میں نے اسے گرون سے پکڑا اور ہمیشہ کی طرح لمبپ کے نزدیک لاتے ہوئے پوچھا۔

”ابے تو میرا بوٹ پہن گیا تھا، کس نے اجازت دی تھی تجھے؟“

لیکن زینو نے میری طبیعت کے کمزور مقام کو پالیا تھا جیسے خطرے کے وقت جانور عقل حیوانی سے اپنے دل کو پالیتے ہیں۔ وہ اپنے سیدھے ساوے لفظوں سے مجھ میں ایسے جذبے بیدار کروتا کہ میرے ہاتھ اٹھتے اٹھتے رک جاتے۔ وہ بولا۔
”وہ آپ لوگوں کو خیال ہی نہیں آتا۔ جب آپ بوٹ پہننے سے پھریں اور میں اتنی سرودی میں شگے پاؤں پھروں تو یہ کیا انسانی (انسانیت) ہے، وکیو تو میرے پاؤں کیسے سوچ رہے ہیں؟“

اور زینو اپنے شگے پاؤں دکھانے لگا۔ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے اور سوجے ہوئے تھے ایڑیوں اور تنوں پر آوارگی اور مصائب کے ایک لمبے پوڑے نقشے کے کنٹور تھے جس میں زمانے کے ترقی پسند معمر نے خون کے دریا بنائے تھے۔ میں نے زینو کی گون چھوڑ دی اور بوٹوں کی پاؤں میں پہن کر دیکھا۔ میرے سوئیڈ کے بوٹ دو انگشت کے قریب کھل چکے تھے اور کچھ میں میبک کی ایک گدھ کی نقش کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

بالکل ایک ہی کمرے میں کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک انسان چپڑ میں لیٹا رہے اور دوسرا اس کے سامنے سردی سے اکڑا کر رہے؟ ایک انسان کے پاؤں سردی سے پھٹ جائیں اور دوسرا نرم و گرم موزے زیب تن کرے ایک انسان گرم گرم چائے کافی یا برانڈی پی کر وقت مقام اور امانیت کے جدید نظریوں پر بحث کرے اور دوسرا ان باتوں سے بے بہرہ ایک کمرے میں و بکا ہوا شدت کی تنہائی اور تنہائی محسوس کرتا رہے؟ ایک شخص کے پاس جو حس رانی کے لئے وافر وہ یہ پیہ ہوا دوسرے کمرے سے محروم رکھ کر اس میں جنسی عیوب پیدا کئے جائیں۔

ان دونوں میں سے ہاتھ نغیبات کی ایک کتاب آتی۔ اسے پڑھ کر میں نے زینو کی اس قبیح عادت کے ہر پلو پر غور کیا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچ سکا کہ زینو کی اس فطرت کا باعث محرومی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا ہی سے اسے ہر چیز پر نعمت زندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ علم، تہذیب، مذہب، اشرفات اور قانون کی آڑ میں اس کے قدرتی حقوق غصب کئے گئے ہیں۔ اسی لئے وہ پوری کرتا ہے۔ دوسروں کے بوٹ، ٹنگیاں، گھڑی اور سوئیڈ کے بوٹ پہن کر عورتوں کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے اور اب چوری ایک دیرینہ بیماری کی طرح جڑیں پکڑ چکی ہے۔ اس کے انداد کے لئے کتنی اکیر کی ضرورت ہوگی۔ کتنا کام زیر زمین کرنا پڑے گا۔ کتنا وقت درکار ہوگا اس ناسور کو جوڑے اٹھاڑنے کے لئے.....

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بوٹ میں زینو کو قسے دول گا، وہ انگشت تو وہ پہلے ہی کھل چکے ہیں۔ ان کا مجھے فائدہ ہی کیا۔ اس کے علاوہ میں نے سوا پانچ روپے میں کھروا ماخا کی ٹی کا کوٹ زینو کے لئے خریدا تاکہ وہ سردی سے نہ لپکے بلکہ

تن کر میری باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے اور میں چپکے سے رہاؤں۔۔۔۔۔
 جذبات ہی تو ہیں!

میں خرااں خرااں گھر کر لوٹ رہا تھا اور سوچتا تھا کہ آج زینو کتنا خوش ہوگا۔ وہ مجھے کیسا فرشتہ سیرت سمجھے گا۔ اس خوشی میں وہ کتنی چھلانگیں لگائے گا مجھ سے پیٹے گا۔ کہے گا۔ اللہ تمہیں ایک خوبصورت بیوی دے۔ اللہ سب کا رازق ہے۔ اللہ خیر اللہ تین۔۔۔۔۔ میں نے "وارالامان" میں قدم رکھا۔ زینو اسی طرح ایک سفینگی کیشے کی مانند سکر کر ایک کونے میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا آج شاید پھر اس غریب الدیار کو کسی نے مارا ہے۔ میں ان جذبات سے کور سے، عقل مند وحشیوں کو اس کی اچھی طرح سنا دوں گا۔ میں ان لوگوں کو اب بھی خرید سکتا ہوں۔ زینو کے ان سے تمام رشتے ٹاٹے توڑ سکتا ہوں۔ لیکن نہیں۔ زینو کو کسی نے نہیں پیٹا تھا۔

میں نے کونے میں پڑے ہوئے زینو کو کان سے پکڑ کر اٹھایا۔ یہ حرکت میں نے اس وجہ سے کی کہ زینو سمجھے گا کہ آج پھر مجھے کسی جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی ہے اور اس شک و بیم کے درمیان جب اسے پتہ چلے گا کہ اسے کوٹ اور بوٹ بخشش میں دیئے جا رہے ہیں۔ تو اس ڈر کے مقابلے میں خوشی کتنی جھٹاک طور پر خوبصورت ہوگی۔

میں نے زینو کے کانوں کو اچھی طرح سے مرڈا۔ درد کے ایک اہماں سے وہ آہستہ سے کراہ اٹھا۔ لیکن اس نے مطلقاً نہ پوچھا کہ رہ سزا اسے کیوں دی جا رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اسے تھوڑا دیا۔ وہ اب کانپ رہا تھا مروی سے نہیں، خوف سے کیونکہ اس نے کوئی جرم نہ کیا تھا۔۔۔۔۔۔۔

گورن

میں نے کہا: ”دیکھو میٹا، تیرے لئے کوٹ لایا ہوں“
ایک لمحہ میں زینو کا خوف دور ہو گیا۔ وہ میرے قریب سرک آیا اور کھوکھے کی
پیٹی کے ہمارے کھڑا ہو گیا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی فرشتہ میٹھے وقت اپنے پر
سنوارتا ہے اپنی آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے میں نے کہا:-
”وہ بوٹ بھی اب تمہارے ہیں“

زینو مسکرایا۔ بالکل خفیف طور پر، اس نے سپرٹ مجھ سے لے لیا اور اسی وقت
اسے کندھوں پر ڈال لیا اور بولا:
”میں جانتا تھا! تم میرے لئے کوٹ لاؤ گے۔۔۔۔۔ تم مجھے بوٹ دے دو گے!
یہ بھی جانتا تھا“

اور اس کے بعد وہ کوٹ کے ٹبن احتیاط سے بند کرتے ہوئے اپنی پٹائی پر جا
لیٹا۔ مجھے اس کی ناشکر گزادی پر سخت غصہ آیا۔ میں نے دل میں کہا: ”آئندہ میں زینو
پر ایک پسینہ بھی خاتج نہیں کروں گا۔ اس کا فائدہ ہی کیا؟ اس نے میرا شکر یہ تک
ادا نہیں کیا۔ اس کے بعد سب میں خان کے ساتھ چار پائی پر لیٹا تو مجھے غصہ کی
وجہ سے فیندہ آئی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک خیال رنگیتا ہوا میرے ذہن میں آیا۔ کیا
اس کے بعد شکر گزاری کی ضرورت ہے؟ گویا کیرٹ سے کو گندگی میں سے اٹھانے اور
ڈنک سنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد مجھے ایک خاص قسم کا حظ محسوس ہوا۔
جیسے کوئی مجھے کوٹ اور بوٹ کی قیمت ادا کر رہا ہو!

ایک دن میرا ایک مترجم دست میرے پاس آیا میں نے اس سے زینو کا تذکرہ

گرہن

کیا اور خاص طور پر زینو کو کوٹ اور بوٹ ہیا کرنے کا واقعہ سنایا۔ اس نے میرے جذبات کو سراہا۔ مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی اور میرا رنداں رنداں شہرت اس کا س سے جاگ اٹھا۔ میرے دوست نے بتایا۔ زینو کی چور ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کے ہاتھ میں پیسے نہیں دیا گیا جسے وہ آزادانہ خرچ کر سکے۔ ایک کوٹ یا چٹری کی بجائے اس کے ہاتھ میں کچھ نقدی دینا بہتر ہوگا۔ ایسی نقدی جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکے۔

اس کے بعد وہ مترجم شخصت ہوا اور میں نصف شب تک اس بات پر غور کرتا رہا۔ اگلی صبح میں نے زینو کو پاس بلایا اور ایک روپیہ اس کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

”زینو، بیٹا۔ لو یہ خرچ کو لینا لیکن ذرا احتیاط سے۔
جب ختم ہو جائے تو میں تمہیں اوروں گا۔“

اس دن میری طبیعت نہایت پرسکون رہی شام کو آیا تو میں نے باتوں باتوں میں روپے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ زینو روپیہ کتنی احتیاط سے خرچ کرے گا۔ لیکن شام سے پہلے پہلے زینو نے روپیہ ختم کر ڈالا تھا اور دو روپے کی درخواست پیش کر دی تھی۔ تب میں نے جیب میں سے دوسرا روپیہ نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو میں ٹھٹھک گیا۔ اگر اس حساب سے روپے خرچ ہونے لگے تو دیوالیے کی درخواست دینی پڑے گی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا گو یا خور و بار بائگ دہل کہہ رہی تھی ”اب کہو؟“

لیکن میں نے غرو کو جذبات پر غالب نہ آنے دیا۔ میں نے بوش عمل کے

جذبے سے ایک روپیہ نکالا اور کہا:

”زینو..... لو ایک روپیہ اور..... بس میں ایک ہی دے سکتا ہوں لیکن یوں گزارہ نہ ہوگا۔ احتیاط سے خرچ کرنا!“

اس کے بعد جب میں شام کو دفتر سے لوٹا تو زینو پہلے سے موجود تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے روپیہ میرے سامنے پھینک دیا۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں!“ وہ بولا۔

”کیوں زینو؟“ میں نے پوچھا۔

”جب تک پیسہ میری جیب میں رہتا ہے“ زینو بولا ”مجھے سکون میر نہیں ہوتا۔“

گویا وہ میری جیب سے اچھلا پڑتا ہے۔ جب تک اسے خرچ نہ کر ڈالوں۔ مجھے بہت کوفت ہوتی ہے.....“

میں نے سخت تذبذب میں روپے کو ہاتھ میں تھامے رکھا اور لمپ کے گرد طواف کرنے والے ایک پروانے کو دیکھنے لگا۔ عجیب بات تھی۔ زینو کہ ایک روپے کو خرچ کرنے کی بھی اہمیت نہ تھی۔ ایک روپیہ جیب میں ڈال کر اسے خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ لذیذ ترین مٹھائیاں، خوب صورت ساڑیوں میں لمبوس عورتیں اور کیا کچھ نہیں خرید سکتا۔ گویا وہ ایک چھوٹا برتن ہے جس میں زیادہ پیسہ نہیں سما سکتی۔ وہ ایک روپیہ بھی جیب میں نہیں رکھ سکتا اور جب اس کی جیب خالی ہوگی تو وہ چوری کرے گا اس پر ایک جھوٹا رسی ہو چکا تھا..... لیکن کیا مجھ سے زیادہ جذباتی آدمی بھی کوئی ہوگا جو اسے ہر روز ایک روپیہ دے سکے..... جذبات!..... جذبات! جو کہ چوری سے بھی زیادہ جسم و انگیز ہیں۔

گولہ

پوری سے زینو کو روکنا بے سود سمجھ کر میں نے اس ضمن میں اسے کچھ کھانا منانا ہی چھوڑ دیا۔

اسی شہر کے محلہ قاضی عبدالغفار میں میری ہمیشہ رہتی ہے۔ میرے ہسنوئی محلہ ڈاک میں ایک اچھی گزرا رہے کے لائق آسامی پر متعین ہیں۔ میری ہمیشہ کے تین بچے اور دو مکان ہیں۔ شہر میں میرے ہسنوئی کا کافی رسوخ ہے۔ کچھ دنوں سے میں شادی کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ اب میں تیس برس کا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے سے گرم ملک کا باشندہ تھا اور کثرت سے چاٹ کھانے کا عادی۔ ضرورت جوانی میں بھیجی اور خالہ کے ہاں سے رشتے آئے تھے۔ مگر مجھے ان دونوں لڑکیوں سے کچھ چڑھتی۔ وہ دونوں لڑکیاں خوب صورت اور بے وقوف تھیں۔ اس کے بعد ہمیشہ کہنے لگی۔ وقت گزر چکا ہے اور اب تو میرے سر میں کوئیں سفید بال دکھانی دینے لگے تھے۔ ہندوستان کی اوسط عمر سے زیادہ ہو چکا تھا اور یہی کیا کم قیمت تھا! لیکن میں ایک عورت کی شکل دیکھے بغیر ہی مر جاتا تو کیا جنت کے دروازے مجھ پر کھلے رہتے؟ میں نے ارادہ کیا کہ کسی معتبر آدمی کے ذریعے شادی کے متعلق کھوا بھجوں اور جب ہمیشہ تھوڑا سا بھی اصرار کو ملے تو مان جاؤں۔ آخر کھانا پکانے کے لئے بھی تو ایک عورت چاہئے۔ گویا میں سارا دن مردانے میں بیٹھا رہوں گا اور بیوی باورچی خانے میں! اور دل کہہ رہا تھا۔ دارالامان کی جگہ المنظر کی ضرورت ہے، زینب خالہ کی لڑکی خوب صورت ہے تو خوب صورت ہی تھی۔ بے وقوف ہے تو بے وقوف ہی تھی۔ باورچی تو ابھی ثابت ہو گئی۔

اس کام کے لئے میں نے جس معتبر شخص کو ڈھونڈا وہ زینو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ زینو کافی عرصے سے میری ہمیشہ کے ہاں متعارف تھا۔ ویر سے حاجی گوگم حاجی گوگم کا سلسلہ شروع تھا۔ میں نے زینو کو رضا مند کیا کہ وہ وہاں پہنچ کر میرے لئے زمین تیار کر دے۔ میری شادی کا تذکرہ بھیڑے۔ ہمیشہ جو مدت سے میرا گھر آیا وہ دیکھنے کی خواہش مند ہے مجھ سے خود ہی اصرار کرے گی اور پھر میں زینب کا قہر چھیڑ دوں گا۔

ایک نیک ساعت دیکھ کر میں اور زینو گھر پہنچے ہمیشہ قریب آکر ٹہنچی تو میں عمداً کسی ہانے سے وہاں سے چلا گیا۔ دراصل میں نعل کے دروازے کے پاس کھڑا رہا۔

”ہاں کی شادی کیوں نہیں کر دیتے آپ؟“

”مانے بھی“ آپا بولیں۔

”اصرار بھی تو نہیں کیا آپ نے کبھی؟“

”اصرار کی خوب کہی تم نے؟“ ہمیشہ نابالہ ہاتھ پھیلا کر بولی ”اس ڈھیٹ آدمی

نے پھر بھی اور خالہ کے سامنے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ اب تو میں اسے کبھی نہیں کہنے کی؟“

میں تھلا کر رہ گیا لیکن میرا ہونہار وکیل کہنے لگا۔

”بچپن تھا آپا اس وقت تو۔۔۔۔۔“

ہمیشہ نابالہ ایک چائے کی پیالہ اس کے سامنے رکھتی ہوتی بولی۔

”یہ تو کبھی نہ کہوں گی، تم مالاو اسے۔۔۔۔۔“

میں موقع مناسب دیکھ کر کمرے میں داخل ہوا اور ادراہ مراد تصویریں پٹکا دیں

گھر میں

ڈالتے ہوئے بیٹھ گیا ہمیشہ چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی:

”ہی! ایک پیالی“ اودھ بولی ”شادی کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟“

سردی تھا کہ ہمیشہ کے سامنے میں جھوٹا سچا بھکار کرتا۔ میں نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا: ”شادی؟ تو بہ! تو بہ! میں اس رات میں بیٹھنا نہیں چاہتا میرا طبع نظر شادی سے کیسے بند ہے“

زینو نے آنکھ مارتے ہوئے کہا: ”اودھ اور میں؟“

میں نے چلاتے ہوئے کہا: ”جو کس بند کردار زینو کے بچے، جہانگیر ریٹورن میں برا کھانا تاکا ہے کیا؟“

اب جو کچھ زینو نے کہا وہ بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ مڑھا اور مجھ سے مانگ کر پہنی ہوئی پہنوں کے گیس کو کھینچتے ہوئے بولا۔

”ایسے بے ذہب انسان مجھے بالکل پسند نہیں۔ خود ہی مجھے تیار کیا کہ میں جا کر شادی کے لئے زمین تیار کروں اودھ اب مجھے ہی خجل کرنا چاہتے ہو کیا؟“

زینو جتنا خجل ہو سکتا تھا ہو چکا تھا اب میری بادی تھی۔ پسینے کے قطرے اتنی سردی کے باوجود میری پیشانی پر پیدا ہو گئے۔ میں ہمیشہ کے سامنے برابر بھکار کرتا رہا۔ گھر اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔ زیادہ سے زیادہ میں نے یہ کیا کہ ننھے بچانے کو گودی میں اٹھایا اور ہنسنے کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:

”یہ کس کے آپا ہیں؟ تمہارے؟ اسے محو کتے ہو؟ اسے تو اکتے گندے ہو تم؟“

گرم

اور پھر ہمیشہ کے مخاطب ہوتے ہوئے میں نے کہا:
 دیکھ بھی کتنا ہو گا، اچھا ماموں ہے میرا۔ بالکل خالی ہاتھ چلا آیا ہے
 اور اپنے بھانجے کے گالوں کی چٹکی لیتے ہوئے میں نے کہا:
 ”اب کی دفعہ میں تمہارے لئے چیری لائوں گا۔ چیری؟ اور مافی..... کیا تم
 نے کبھی مافی بھی کھائی ہے؟..... مافی چیری سے بھی زیادہ مٹھی ہوتی ہے۔“
 میری ہمیشہ مسکراتی رہی۔ اس کے بعد ہم نے نشست لی۔ راستے میں میری زینو سے
 خوب لے وے ہوئی میں نے کہا ”تمہیں دارالامان میں چل کر میٹوں کا سلسلہ لگوا دینا چاہیے
 کے لئے دارالامان سے زیادہ عورتوں اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے۔ میں پرگندہ دل کے
 ساتھ اپنی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اپنی بید کی چھڑی تلاش کرنے لگا۔ وہاں ہمدی
 اسلام ہمارا انتظار کر رہا تھا اور وہ بید کی چھڑی اس کے ہاتھ میں مخمی پستہ چلا کر زینو
 نے ہمدی کا پین ہوا کاس کی نیب صراف کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے، یہی چارہ آٹھ
 آنے لے لئے ہوں گے۔ مقتول قلم کا جسم مافی میں سے ملا۔ بچا رہے کے سر سے نیلا
 نیلا خون بہہ رہا تھا۔ زینو کی قمیص کی جیب میں سیاہی کا ایک بڑا سا درجہ چوکی کا شاہد تھا۔
 اس دن میں نے دونوں باتوں کے لئے زینو کو میٹھا ادا کیا۔ بالکل جاؤ سوئے کے
 بچے..... شہدے، سوا مزاد سے بالکل جاؤ فوراً یہاں سے۔“

اسی وقت میں نے زینو کو میٹر میٹوں میں سے دھکا دیا۔ دو چار میٹر میٹوں پر سے
 لڑھکتا ہوا آخری میٹر میٹ پر جا رہا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ یوں دکھائی دیتا تھا
 جیسے اس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا ہو۔ مقوڑی دیر کے بعد زینو اٹھا اور پیچھے کی طرف
 دیکھنے لگا۔ گویا اسے کسی بات پر یقین نہ آتا ہو جب وہ کچھ دور جا کر میری جانب دیکھنے

گروہ

کے لئے رکا تو اس خوف سے کہ کہیں وہ اپنی عقل حیوانی سے بھر پر فتح یاب نہ ہو جائے
میں نے دیوار کے قریب سے ایک اینٹ اٹھائی اور زینو کی ٹانگ پر دسے ماری۔
زینو کی چیخ ریسٹوران تک سنائی دی اور وہ بلبلا تا ہوا جھینٹ گیا۔ میں نے ایک اور اینٹ
پھینکی، زینو ٹنگڑا تا ہوا اٹھا اور اسی حالت میں رینگتا ہوا آہستہ آہستہ تمام کے
بلے ہمارے منجھوٹے حیر سے میں کہیں غائب ہو گیا۔

اس سخت سردی کی رات میں جبکہ جھینگ بھی برشام ہی سے شور مچانا چھوڑ دیتے ہیں
میں اپنے بستر میں لیٹا، اس کی نرمی گرمی محسوس کرتا ہوا سوچتا ہوں۔ میرے سینے میں دل
حرکت کرتا ہے۔ میری قوت متحیقہ بڑی بند ہیں ہے۔ جب وہ ریل کی لائنوں یا دریا کی
گہرائیوں کو پاتی ہے۔ تو یہ دل شدت سے دھڑکنے لگتا ہے۔ جب شریف کا تب
جزائیفہ کے ایک کوریس کی کتابت کرتا ہے تو مجھے وہ لفظ دکھائی دیتے ہیں "زمین
اہستہ محور کے گرد حرکت کرتی ہے" میں سوچتا ہوں۔ کیا عجیب جوہر ساکن ہو جائے
اور جب کتاب کے ساتھ نقشہ دکھائی دیتا ہے تو میں حیرت سے پوچھتا ہوں یہ کس
زمین کے کنوڑ ہیں؟ یہ ہلکے ہلکے پتلے پتلے دریا جو نیلے رنگ میں دکھائے گئے ہیں۔
ان کا قدرتی رنگ تو سرخ ہے۔

یہ مصنف کتنی مسخیرا کے ساتھ وقت انتہام اور اسرافیت کے متعلق باتیں کرتے
ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ سخت سردی میں منجمد ہو جائیں گے۔ اور جب یہ
وکیعتا ہوں کہ ہمارا ایک مجوزہ ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے تو
اس وقت مجھ پر حسرتوں کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں دارالامان کے اندر بڑھی

تیزی سے اِدھر اُدھر گھومتا ہوں اور کہتا ہوں۔ میں کیوں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا۔ کہ مجھے باورِ حق کی زیادہ ضرورت ہے یا ذنیو کی۔

خان کی مشہور سنگی شب دروازہ کھولتی پر لٹکی رہتی ہے اور شریف کی گھڑی صبح و شام بتاتی پر پڑی ٹک ٹک کرتی ہے۔ جوائے لیسٹوران کا بل ادا کیا جا چکا ہے۔ فونین پن کے پیسے بھی پکا دستے گئے ہیں۔ لیکن اب بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کسی کا کچھ ادا کرنا ہے۔ لیکن میرا قرض خواہ کوئی بڑا بے نیاز آدمی ہے جسے اپنے پیسے کی رتی بھر بھی پروا نہیں۔

بھوٹے سے اپنا سوٹ کبیں کھوتا ہوں تو مجھے فوراً ہی اسے بند کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے کونے میں دو دانت پڑے ہیں اور ایک کونے میں سینڈ سے سے لکھا ہے۔ زین العابدین یعنی عایدوں کی زینیت !

کل ہی میں نے فلیکس کا ایک نیا بوٹ خریدا ہے جب میں اسے پہنتا ہوں۔ تو وہ چیختا ہے، چلاتا ہے۔ بھلا اسے کس بات کا دردنا ہے۔؟ نئے چمڑے کا ہے نا، اور وہ کم بخت چمڑے بھی تو میرے بجاری جسم پر چورا نہیں آتا۔

جب ہم شام کو سوٹ پہن کر دارالامان سے نکلتے ہیں تو ہم کتنے بہتر انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ہم ہنستے ہیں لیکن تہذیب کے وہاں کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ آخر والدین نے ہمیں تربیت دی ہے۔ ہم منظر کو گلے میں اور سوزوں کو ہاڈس میں خوب کھینچتے ہیں تاکہ سردی لگ جانے کا خدشہ نہ رہے اور جب کوئی سڑک پر بیاتی ہوئی لڑکی ہماری طرف دیکھتی ہے تو ہم فوراً اپنی مائی کی گرہ کو درست کرنے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی باتوں باتوں میں شریف رحید کو صالاکہ دیتا ہے۔ وحید پور سے زور

سے ایک چپٹ اس کے منہ پر جبا دیتا ہے اور ایک ہفتہ تک وحید مستری کی ہتھوڑے
 پکڑنے والی انگلیوں کے نشان شریعت کے گالوں پر دکھائی دیتے ہیں اور جب ہم
 اپنے ارد گرد غور سے دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں۔ نہ کوئی کسی کا باپ ہے نہ
 بیٹا، بہنوئی ہے نہ سالار، ماموں ہے نہ بھانجا، گویا سب رشتے ناطے ٹوٹ چکے ہیں۔
 اللہ! تمام دنیا کیسے شریفوں کی دنیا میں بدل چکی ہے۔ گویا ہم ایک دارالقرآن
 جگہ اس سے بھی ادھر ایک غلدہ بریں میں رہتے ہیں!

لارے

MEHRAN LIBRARY
B-61 Bhangorwa Town
Azadabad Karachi
TIME 6 to 10 pm

میرے چھوٹے کے باہر، سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا گڑھا ہے جسے گزشتہ ہفتے کی رات کو بارش نے بھر دیا ہے۔ بالکل ایک چھوٹے سے دل کی طرح جس میں جذبات کے مدوجرز پیدا ہوتے ہیں اس گڑھے پانی والے گڑھے میں بھی لہریں اٹھتی ہیں، اپنے محدود ساحلوں سے ٹکراتی ہیں، فنا ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی میں اپنے گھر کے پکس، بانسوں کے ایک ٹھنڈے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوتا ہوں اور اس گڑھے میں طیر پانے کے جو اٹیم سے بھرے ہوئے گندے پانی کو بڑے غور سے دیکھتا ہوں اسے جاکر اس میں کچھ پانی کے بادل پیدا کرتا ہوں اور وال بگھاتی ہوئی عزیزہ کو آواز دے کر کہتا ہوں: ”عزیزو! اگر یہ گڑھا ایک خوب صورت جھیل ہوتا تو کیا ہوتا؟“

گرفتن

عزیزہ حسب معمول ایک سوکھی سی ہنسی ہنستے ہوئے میری بات کو دہرائے ہی پر
اکٹھا کرتی ہے اور میں سوچتا ہوں اگر یہ گڑھا نیلے پانی کی ایک خوب صورت جمیل جوتا
تب بھی شاید عزیزو کے دلی کی دھڑکن ویسے کی ویسی رہتی لیکن اس کے
باوجود جمیل کا خیال آتے ہی میرے دل کا تمام جراثیم سے پٹا ہوا گندلا پانی متحرک
ہو رہا ہے اور میں جذبات کے ڈونگے پر بیٹھا ہوا پانی میں بہت دور نکل جاتا ہوں
غالباً پانڈنی رات ہوتی ہے اور میں حشیا نہ انداز سے گاتا ہوں — اور
پانڈنی راتوں کے حسنا اس وقت مجھ پر آبی پوک کی سی مجنونا کیفیت
طاری ہوتی ہے اور میں خوشی اور خوشی کے ہر پونڈ کو خوشی اور خوشی سمجھ کر جمیل کے
وسیع پانیوں میں ڈوب رہا ہوں۔ کاتھیری ڈل کے وہ تمام نظارے میرے ذہن
میں پیدا ہو جاتے ہیں جو میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ البتہ ہر سال دیکھنے کا تہیہ کرتا
ہوں لیکن یا تو سرکاری حکم کی تعمیل میں بند و قوں والی بارکوں کا ٹھیکہ ختم کرنا ہوتا ہے
اور یا میرا مختصر سا اثاثہ عزیزو کی دھڑکن کے علاج میں ختم ہو جاتا ہے

بارش کے بعد چوماسا ہوتا ہے اور چوماسے کے بعد بارش و بارش چوماسے کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور چوماسہ بارش کا پیش خیمہ۔ جسے کہ یہ دو دنوں شوریدہ و سرسبزچے آفکھ چولی کھیلتے ہوتے گھر سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد صوب رہ جاتی ہے اور نام اللہ کا۔ کچھ دن تک تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ نام اللہ کا بھی نہیں رہا۔ فقط و صوب ہی و صوب رہ گئی ہے اور اس عالم میں ننھا بھورا سائیس ابلتا جا پاء پر بتیم داس آ زیری مجسٹریٹ اور ججپر کھٹ کے چنید سے میں لگی ہوئی عزیزہ اکسی کو ترفع نہیں ہوتی کہ ذخیرے کے میل اور لمسوڑ سے مل کر تالیاں بجائیں۔ اور نہ ہی کسی کے

شیشم کے گرتے ہوئے تپوں کے لئے نوحے کی توقع ہوتی ہے۔ نباتات، ہسپرینڈ پرنڈ خاکوٹس، انسان و حیوان خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے قدرت کے ممتحن نے ان سے کوئی نصاب سے خارج سوال پوچھ لیا۔ اس وقت پر تنیم دس کا مہبت ناک ڈنگو (گتا) اور میں، دونوں زبانیں باہر نکالے ہوئے اس گرمی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ گرمی میں بارش نہیں، اس کی حسین یاد باقی رہ جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ ہشتی خیال آتا ہے۔۔۔۔۔ کبھی بارش ہوتی تھی، کبھی بارش ہو گی!

ایک شام، بارکوں کے لئے پچھڑس لدا اچکنے کے بعد جب میں اس گرمی کے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ گرمی کے پانی میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے دمدار مینڈک دھڑکے اوہرا اور اوہرے ادھر تیر رہے تھے اور گرمی کے ساحلوں پر لا تعداد ماروے چھٹے ہوئے تھے کبھی کوئی لاروا ایک تخت اپنے سمندر کے ساحل کو چھوڑ دیتا اور لاروا یا نہ، کھلنڈر سے پن سے اپنی دم کو سر کے ساتھ لگاتا، چھوڑتا ہوا بہت دور تک پانی میں نکل جاتا اور گرمی کی تہ میں اُگی ہوئی نباتات میں بسنے والے کرکوں لے درمیان میں سے ہوتا ہوا پھر اپنے ٹھکانے کو لوٹ آتا۔ دمدار مینڈک ان ننھے ننھے جھانجھوں کی طرح، بے ڈھنگے انداز سے تلا بازیاں کھاتے ہوئے کبھی سطح پر پہلے آتے اور کبھی تہ میں بیٹھ جاتے۔ میں نے اسی ٹھنڈ پر کھڑے ہو کر ان جھانجھوں، ناقابل فہم حرکتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آخر کیا چیز انہیں بظاہر بے مقصد اور بے مہنی درپردہ پر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تیرنے کے لئے مجبور کرتی ہے؟ کوئی ریاستی زدن کر بیٹھنے میں لے، کوئی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے یہ اپنی بستی کو

چھوڑتے ہیں، پھر لوٹ آتے ہیں؟ پھر خیال آتا ہے شاید یہ لار دے، یہ ہر ایشم یہ دمدار
مینڈک پر آگندہ خیالات ہیں جو گرمی کے دل میں اٹھتے ہیں جیسے کبھی کبھی میٹھے میٹھے
مجھے خیال آتا ہے کہ کل ڈھولن کی بڑی ٹومیری طرف دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اپنی انگلیوں
سے سامنے کے قصاب خانے کی دیوار پر کوئی نشان بناتی تھی۔ جی ہاں
اس قسم کا خیال بھی تو ایک لار دے، ایک دمدار مینڈک ہی تو ہوتا ہے جو اپنے غصوں کو کھلنے دے
انداز سے تیرنے کے لئے دل کے ساحل کو چھوڑ دیتا ہے اور پانی میں بہت دور ہو کر
ادر فضول نباتات کے آبی مرغزاروں میں ہوتا ہوا پانی کی سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ کس
کے بعد جب یاد آتا ہے کہ ننھے مجھ پر سے سائیس نے میری گزشتہ ماہ کی انٹنی ملری
ہے تو میں اسے نقصان پہنچانے کے ہزاروں منصوبے لکھتا ہوں لیکن محسوس کرتا
ہوں کہ یہ خیال بھی ایک جھانجھا ہے جو کہ تیرتا ہوا دمدار پانی میں نکل جاتا ہے لیکن پھر
ساحل کو نہ چھوٹتا ہے۔ گویا ساحل اس کے لئے محض ایک منزل نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت
ہے۔ بالکل ایک ایسی حقیقت ہے جیسے میرے منہ پر بخشی دارھی ہے اور میں اچھی طرح
سے جانتا ہوں کہ اس دارھی کو دیکھ کر ڈھولن کی بڑی ٹومیری کیسے نہیں کہتی کبھی قصاب
خانے کی دیوار پر اپنی انگلیوں سے نشان نہیں بنا سکتی۔ ایسے ہی جیسے میرا تمام اثاثہ عزیزہ
کی ایک فضول ادیرنیہ بیماری پر ختم ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے میں کشمیر دیکھنے کے لپاک
ارادے کو دماغ میں گھسنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے گرمی میں اور کثافت پیدا ہوتی گئی اور اس میں
مزید اندھے اور لار دے پیدا ہوتے گئے۔ مجھے ان بد مزید بے ڈول ناکل جھانجھوں
سے ایک قسم کا انس پیدا ہو گیا تھا۔ میں ان کے لئے اپنے دل کے کسی کونے میں محبت کا جذبہ

پانے لگا۔۔۔ ایسا ہی محبت کا مذبذب جو میرے دل میں اپنے بڑے بیٹے فخر کے لئے پیدا ہوتا ہے یا اپنی شیر خوار بچی خالدہ کے لئے۔۔۔۔۔ اس گڑھے میں لمیر یا کے خطرناک جراثیم چل رہے تھے۔ لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ نہ صرف آنریری مجسٹریٹ اور تھے بمبورے کو لمیر یا ہو جائے بلکہ مجھے عزیزہ اور میرے سب بچوں کو یہ بیماری لاحق ہو۔ مجھے ان لادوں سے ایسے ہی انس تھا جیسے کہ مجھے اپنے پرانگندہ خیالات سے محبت تھی۔ اب بھی سبب کسی صبح کو ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو میں چارپائی پر لیٹا ہوا اپنے پرانگندہ خیالات کی مدد سے دنیا سے حقیقت کے تمام ناممکنات کو ممکنات سے ہم کنار کر دیتا ہوں مثلاً سوچتا ہوں کہ ٹھیکے کے سامنے کوٹھی میں بننے والے سمیٹ کے بادشاہ کی نو جوان لڑکی خورشید و میرے پاس چلی آئی ہے۔۔۔۔۔ یا آج میں نے بڑے سردار صاحب کی جیبوں سے نوٹوں کے تمام بنڈل اچک لئے ہیں اور عزیز کو ساتھ لئے، ایک کار میں بیٹھا، کشمیر کی طرف بھاگا جا رہا ہوں۔ اب کشمیر کے نشاط باغ میں ہوں۔ میں اور عزیزہ بڑے بڑے سرخ گلاس ہو کر ڈاکٹر نے اس کے لئے مفید بتلائے ہیں، لکھا ہے ہیں۔ ہماری ٹانگیں پانی میں ہیں اور بر فانی پانی ہمارے پاؤں کو چھوتا ہوا دور کسی نامعلوم جگہ کی طرف جا رہا ہے اور جس طرح میں اپنے دل کو من مانی کا رد وائیاں کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہوں اسی طرح اس گڑھے میں لادوں کو تیرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اب جبکہ گڑھے کا پانی سوکھتا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ ان نرم نرم بھانگوں اور ان مدبر مینڈکوں کا کیا ہو گا؟ کیا یہ چوہا سا کسی ختم ہو گا؟ ایک دن گڑھے کا پانی سوکھ جانے سے یہ سب ختم ہو جائیں گے۔ جیسے میرے دل کی آبیاری نہیں ہوتی۔ کیا اس

گرہن

گرہ سے کی بیماری میں نہ ہوگی؟ میں ہر روز آسمان کے کسی کونے میں ٹھکے ہوئے بادل کو دیکھا کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی سا بادل بادلوں کی ایک فوج کے ہراول میں آتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس دن کیٹی کا داروغہ اس گرہ سے کی طرف آنا دکھائی دیا، میں نے قریب پڑے ہوئے کنیر کے پتوں سے اس گرہ سے کوڑا سانپنے کی کوشش کی لیکن کبھی کی طرح صفائی کا داروغہ بھی طبعی طور پر غلاظت کے تمام اڈوں سے واقف ہوتا ہے اور اس داروغہ کو بھی اس گرہ سے کا علم تھا۔ اس کے ساتھ رامو کمار، ایک خاکروب، دو فوجوان، نو ملازم، ہیلتھ وزیٹر — انسانی تہذیب کے لار سے بھی آ رہے تھے۔ وہ لوگ اس گرہ سے میں لال دوائی پھینک کر تمام جراثیم ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا — اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ میرے فخر کو مار ڈالنا چاہتے ہو، میری خالدہ کو زہر دینے آئے ہو۔۔۔۔۔ لاؤ تمہارا کام میں آسان کئے دیتا ہوں۔ میں میری کے تمام اڈوں سے واقف ہوں اور پختہ ہل کے سقیے میں جراثیم کو تباہ کرنے میں مجھ سے زیادہ کوئی بھی آپ کا مدد معاون ثابت نہ ہوگا۔

فوجوان، ہیلتھ وزیٹر نے پر شکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بالآخر اس نے تمام دوائی میرے ہاتھ میں دے دی کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی اسے تمام گڑبھوں میں پھینک کر ان لاروں کا خاتمہ کو دیا کوں لگا۔ میں نے ان سب کو یقین دلایا، جس کے بعد وہ چلے گئے اور میں نے وہ لال دوائی دائرہ کس کی بیس ہزار گیلن دانی نشکی میں پھونکا دی۔

میں سب کو تنویر کیے کی طرف سے آنے والی مرکز کے پاس پل پر ٹانگیں

ٹکائے اس گڑھے کے قریب بیٹھا تھا اور پھر میرے سر پر سری تانیں لاپتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ میں نہیں جانتا وہ بے بضاعت پٹے اپنی بھاشا میں کیا اور کون سا راگ الاپ رہے تھے، شاید وہ کہہ رہے تھے، اسے اللہ کے نیک بندے! تو نے ہماری اولاد کی خبر گیری کی ہے، ہم تیری اولاد کی خبر گیری کریں گے، اور انہیں جلد ہی اس دنیا کے میل خانے سے نجات حاصل کروادیں گے یعنی میرا کہے سب نے زیادہ تندرست جراثیم فرواد نالہ کے جسم میں داخل کریں گے۔ میں نے جواباً کہا اسے میرے عزیز بھچرو! میں نے تمہاری اولاد کو بچا کر تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ ایک معمولی انسانی فرض ادا کیا ہے۔

گرمیوں کے شروع میں چھاؤنی کے ہیڈ کوارٹر ڈھولوزی جا چکے تھے اور انگریزی رجمنٹ کے بھی نصف سے زیادہ سپاہی وگشتائی اور لوڑ ٹوپا پہنچ گئے تھے، ان دنوں نئے مجورے کابے کار ٹھوسا راون تھان پر بندھا رہتا اور ہر روز دوپہر ایک بجے کے قریب نور زور سے ہنسنایا کرتا، شاید وہ اس ایذا راس مندے والے جوئے کو یاد کرتا تھا جو کہ چند دنوں سے اس کے کندھے پر نہیں ڈالا گیا تھا۔ نئے مجورے کا نشان بیکاری کے دنوں میں یا تو کثرت سے پیشاب کیا کرتا یا اپنی بچاڑی سے لیسہ کو پاروں طرٹ بکھیر دیتا۔ اس کے علاوہ اسے عزیزہ کی دونوں بکریوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان بکریوں کے ہم گشتی اور ہمبی تھے اور انہیں عزیزہ غازی آباو سے جہیز میں لائی تھی۔ جب بگشتی اور ہمبی اپنے گلے کے ٹنگر دوں کر بجاتی ہوئی سبک رفتاری کے ساتھ اس گے پکس سے گزرتیں تو وہ اپنی ٹانگوں کو ہوا میں اچھالنے لگتا اور رستہ ٹڑانے لگتا۔ وہ اپنے جسم کو گزند پہنچانے والی کمبیوں کی بجائے بے ضرر بکریوں کو اپنا دشمن سمجھ لیتا۔ ٹانگیں ہوا میں اچھالنے سے بکھری ہوئی لیسہ میں بسنے والے

تمام پھر اڑنے لگتے اور کپڑوں کا روبرو ان مجھروں کو بھگانے کے لئے فوراً امتاس اور شیشم کے موکھے ہوئے پتوں میں آگ لگا کر گرا و حواں پیدا کر دیتا۔ پیشاب اور لید کے تعفن، مجھروں کی گھون گھون اور دھوئیں کی کثافت سے عزیزہ کا دل اور بھی ڈوبنے لگتا۔

جب باریش کے خدا نے میری عرضداشت مسترد کر دی اور گڑھا زیادہ سوکھ گیا تو میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے پچاسی بھگدے کے مالی سے گنتی مانگی اور نئے بھورے کے ٹوکے ناندے لے کر اس گڑھے تک ایک نالی بنائی اور صاف اور تازہ پانی کو نالی میں انڈیل دیا۔ گڑھا پھر لبالب بھر گیا۔ میں پھر شام کو تاڑی لے کر گڑھے کے پاس جا بیٹھا اور کھانتے ہوئے ان کی تمام نقل و حرکت کا اندازہ کرتے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس تازہ اور شفاف پانی سے ایک ہی دن میں لار دے کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ دھباب کے کناروں سے جدا نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں وہ پہلی ہی پستی اور کھنڈ را پن رہا ہے۔

ان دنوں آنریری مجسٹریٹ کشمیر جا رہا تھا اور اس کی چھوٹی بیوی، عزیزہ کو بطور رشتہ کے ساتھ لے جاتا چاہتی تھی۔ میں حقیقت حال سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ عزیزہ کو بطور خادمہ کے ساتھ رکھنا چاہتی ہے لیکن میں اس بات کے لئے فوراً رخصت ہو گیا۔ محض اسی وجہ سے کہ وہ خواب جن کی تمہیل میں ابھی تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھ سکا اپنی عزیزہ کی زندگی میں پورے ہوتے ہوئے دیکھ لوں اس کے علاوہ نہ کہ ہوا اور صفایا پانی میسر آنے سے عزیزہ کی صحت بھی اچھی ہو جائے گی۔ صرف راستے کے ادبچ نیچ کی وجہ سے اس کا دل ڈوبنے کا احتمال تھا لیکن مجسٹریٹ کی اپنی کار تھی۔

مجھے یقین دلایا گیا کہ وہ لوگ اسے بڑے آرام کے کشمیر لے جائیں گے۔ میں نے ایک نامعلوم خوشی میں لنگی اور مجھے دونوں کو بیچ دیا اور ان بیسوں سے عزیزہ کے لئے کچھ کپڑے لئے اور ایک کپڑا خرید لیا اور ان لوگوں کے ساتھ اسے کشمیر روانہ کر دیا۔

مجھ جیسے لوگ جو اپنے تخیل کی مدد سے کشمیر گڑھوں میں ہی خوبصورت جھیلیں دیکھ لیتے ہیں، قدرت بھی انہیں کشمیر گڑھوں سے پرے جانے کی طاقت نہیں بخشتی۔ اس وقت جبکہ عزیزہ کشمیر کی ٹھنڈی ہوا کھا رہی ہوگی۔ میں اس گڑھ کے قریب بیٹھا ہوں گا۔ لہام کے دھت کا میشر سے اس گڑھ کے پاس ہی گزرتا تھا لیکن صاف پانی کی وجہ سے پہلے جھانکے مرچکے تھے۔ پچاسی بنگلے کے مالی نے مجھے بتایا کہ رانی کے باہی اور گندے ہو جانے سے اور کپڑے پیدا ہو جائیں گے اور دوبارہ مینڈکوں میں بھی وہی پہلی قسمی ہستی عدد کر آئے گی۔ نئے بھروسے کے ٹٹو کا پیشاب بھی اسی نالے کے راستے سے گڑھ میں آنے لگا۔

اور ایک دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جبکہ میں نے پھر مینڈکوں، لالعوں کو پانی میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اپنے مخصوص لمبے ٹھٹھکے انداز سے تیرتے ہوئے دیکھا۔ پانی کے باہی اور پیشاب وغیرہ کی وجہ سے گندے ہو جانے سے گڑھ میں پھر ایک بار رونق پیدا ہو گئی۔ اور میں ایک گوندہ طعن، کھاٹ پر ٹیٹ کر زمین و آسمان کے تالابے ملائے لگا۔

دھوپ اتنی تیز ہو چکی تھی اور چرماسا اس آفت کا تھا کہ پل کے ارد گرد کا سارا رقبہ کھمبوں سے بھر گیا۔ لیکن اس دن سے میں نے کبھی آسمان کی طرف بارش کے لئے نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ آسمان سے تازہ پانی پڑتے ہی یہ کپڑے

گھر

ہلاک ہو جائیں گے اور جب تک یہ پانی پھر کثافت سے آلودہ اور باقی نہ ہو گا مزید لارو سے وجود میں نہیں آئیں گے۔

چوداسے کے دوسرے دن بڑی موسلا دھار بارش ہوئی۔ اس وقت میں تن تنہا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا اپنا پٹھا ہوا پاجامہ سی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لالہ کا دواہ کابل کیسے ادا ہو گا کہ باہر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے نوراً اٹھ کر دروازہ کھولا میرے سامنے تار کا ہر کاہ تھا۔ عمرتیس پینتیس برس کے قریب ہو گئی۔ چہرے کے سیاہ رنگ اس سے دو شرخ ڈوروں سے بھری ہوئی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ اس کی خالی وردی تمام بارش میں بھیگ چکی تھی اور پانی کے قطرے اس کی کنپٹیوں سے ہوتے ہوئے دائرہ کے بالوں سے قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہے تھے۔ ایک انگلی سے چہرہ پونچھنے کے بعد اس نے خاکی ٹیوڈ گے نیچے سے ایک بھیگتا ہوا لفافہ نکالا اور بولا "میاں عزیز الدین، ٹھیکیدار کے مختار آپ ہیں؟"

میں نے بغیر جواب دیئے اس بھیگے ہوئے لفافے کو ہاتھ میں لے کر کھولا تار پر تنم داس کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا "عزیزہ کرپاڑ کا سند رست پانی راس نہ آیا۔ لمبے کل بلی ڈاریا کرپاڑی بچش کی شکایت ہوئی اور آج اپنا تک صبح کے سات بجے وہ گئی۔ چونکہ تمہارا ایک دن میں پہنچنا مشکل ہے اس لئے میں ڈاکٹر کی سند لے کر اسے دفن کر رہا ہوں۔ اپنی رضا مندی بذریعہ تار بھیجو۔"

میرے دماغ نے اس حادثے کی اطلاع کو قبول نہ کیا۔ میں نے فقط دروازے تک پہنچتے ہی تے اتنا کہا "اے خدا تو اپنی بارش کو قیام لے۔"

گھر میں بازار میں

دیوار پر لٹکتے ہوئے شیکو شانے مسیح کے آٹھ بچا دیئے۔ درشنی نے آنکھ کھولی اور ایک سو ایسے نگاہ سے نئے، آبنوسی کلاک کی طرف دیکھا جس کی آٹھ سرلی خیزیں اس کے ذہن میں گونج پیدا کرتی ہوئی ہر لحظہ مدغم ہو رہی تھیں..... ایک ٹھنسا سائیلن تھا اور یہی ایک کلاک جو درشنی کے ہستاد نے اسے شادی کے موقع پر بطور تحفہ دیا تھا شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی شاگرد ایک اچھی بیٹی ہونے کے علاوہ ایک اچھی بیوی بھی ثابت ہو جائے..... اور ہر روز صبح شیکو شانے مستقل، طنز بہ انداز میں مسکراتا ہوا کہہ دیتا۔

”میں سب کچھ جانتا ہوں، لیکن اب تو آٹھ بچ گئے ہیں، سست لڑکی!“
درشنی کا پورا نام تھا پیریہ درشنی۔ پیریہ کا مطلب ہے پیاری اور درشنی کا مطلب ہے

— دکھائی دینے والی یعنی ہو دیکھنے میں پیاری لگے، دل کو لمبائے، آنکھوں میں نشہ پیدا کرے — شاید اسی لئے درشی کو راست بھر جاگنا پڑتا تھا اور شکیوٹا سے نظریں چرانا ہوتیں۔ درشی بچپن ہی سے عصبی طور پر نحیف اور ضرورت سے زیادہ حساس تھی اور اب شادی کے بعد محبت کی بے اعتدالیوں سے وہ نسوں کی اور بھی کمزور ہو گئی۔

سسرال میں چند دن کے بعد جو سب سے بڑی وقت درشی کو پیش آئی۔ وہ اپنے خاندن رتن لال سے پیسے مانگنا تھی۔ اس سے پہلے وہ اپنے باپ سے بلاتال پیسے مانگ لیا کرتی تھی اور اگر کبھی وہ اپنے مریعوں کے کام میں چوک بھی جاتے تو درشی، ان کی لاڈلی بیٹی، ان کے کوٹ کی جیب میں سے ضرورت کے مطابق نکال لیا کرتی، پاپا، لاکوٹ ہمیشہ زمانے میں کسی بیٹی کوٹ کے اوپر لٹکا ہوا مل جاتا تھا۔ اپنے میکے سے جتنے پیسے وہ مانگ لاتی تھی۔ وہ سب اشکن کے پیسوں سمیت ایک خوب صورت، طلائی گھڑی پر ختم ہو چکے تھے۔ خرچ کی یہ مددہ رتن سے چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ رتن سے ضرورت کے مطابق پیسے مانگتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔ جب ان کی ردحوں کا ملاپ ہو گیا، تب وہ پیسے مانگ لے گی۔ اس صورت میں وہ پیسے مانگ کر بکتا نہیں چاہتی تھی۔

کئی دفعہ بازار میں کسی چیز کی خرید ہوتی تو درشی اپنی پتلی پتلی، نازک، کمانتی ہوئی انگلیاں اپنے سارے خوب صورت لیکن خالی بٹوسے میں ڈال دیتی اور کہتی — ”چھوڑیے، رہنے دیجئے۔ پیسے میں درں گی“

رتن لال اسی وقت درشی کا ہاتھ تمام لیتا اور سیلزمین سے نظریں چرانا ہوا، محبت

گروہ

کے انداز سے درشی کی طرف دیکھتا اور کہتا۔

”ایک ہی بات تو ہے، ورثی“

اس وقت درمی رعیت کی ایک پُر لطیف ٹیس محسوس کرتے ہوئے چپا ہو جاتی اسے یقین تھا کہ رتن کبھی بھی اسے پیسے ادا کرنے نہیں دے گا۔ کیا وہ اس کی بیوی نہیں ہے؟ آخر کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ خود ہی اس کے تمام بھونٹے سونٹے خرچوں کا کفیل ہو؟

ان دنوں ہر سات شروع تھی اور رتن کا برساتی کوٹ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ ہارنٹس کے قطرے اس میں کسی نہ کسی طرح گھس ہی آتے تھے۔ اسے خریدنے کے لئے درمی اور رتن بازار گئے۔ موٹیلکاسٹور میں انہیں ایک اچھا سا کوٹ مل گیا قیمت ملے ہونے سے پہلے درمی نے حسب دستور بیگ کے ٹن کھول دیئے اور بولی: ”پیسے میں دیتی ہوں“ رہنے دیجئے ۴

دکن لال نے اپنے ہاتھوں میں دس کانٹاں ملے ہوئے کہا۔

”اچھا تو تمہارے پاس ریزٹکاری ہوگی؟“

درشی گھبرا اٹتی۔ اس کی ٹانگیں کا پٹنے لگیں۔ اس نے یونہی کچھ دیر کے لئے بیگ کو ٹٹولا اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

”ادھ! بھول گئی میں۔۔۔۔۔ دیر لگا دی تو میرے پاس بھی نہیں“

رتن لال نے اسی آٹا میں انگلی کے گرد نوٹ کے بہت سے چکر دے ڈالے اور
عصی طور پر کمزور درختی خاموش رہنے کی بجائے کہنے لگی ”ریز گاری تو گھر ہی رہ گئی
میرے پاس تو پانچ پانچ کے نوٹ ہوں گے“

گرفتن

درشنی نے غالباً یہی سمجھا کہ رتن لال پھر ایک دفعہ مٹی کی گھاڑ سے اس کی طرف دیکھ لے گا اور پھر پیسوں کی اداسی کی کاسوال ہی نہیں اٹھے گا۔ لیکن وہ یہ بھول ہی گئی کہ شادی کو ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور اب تلف کی چنداں بات نہیں رہی۔ رتن نے کوٹ کو اتارتے ہوئے کہا۔

”تو اچھا، پانچ پانچ کے دو نوٹ ہی دے دو ایہ لو لو رکھ لو دس کا نوٹ“
اس وقت درسی کے کان گرم ہو گئے، جسم پر چوٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے
بلاوجہ برساتی کو ادبہراؤ دہراٹا ناشروع کر دیا۔ برساتی کے ایک کنارے پر سوراخ
تھا۔ اس سوراخ میں اسے نجات کی راہ دکھائی دی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
اس نے نہایت خشکی میں انداز سے کہا۔

”یہ تو پھٹی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ کڑی مہم کی نہیں یہ“

اور پھر دوکاندار کو مخاطب ہوئے اسی لمحے میں بولی یہ بھلا آپ نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے جی، جو بیٹھا اکوٹ ہمیں سڑک پر رہے ہیں؟“

سیلز مین بالکل گھبرا گیا اور فوراً نئے کوٹ لینے کے لئے دوکان کے اوپر چلا گیا۔ درشی کی برہمی کی وجہ سے رتن بھی سہم گیا اور ایک مصنوعی غصے سے دیکھنا شروع کر دی۔ اس وقت درشی نے رتن کو بازو سے پکڑا اور باہر لے آئی۔ رتن نے میرٹھی پر سیلز مین ہراسیتوں کے بوجھ سے لدا ہوا شاگ دوم سے نیچے اتر رہا تھا۔ لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وحشیانہ جوڑا نظریں سے غائب ہو چکا تھا۔ . . .

راتن نے دیکھا درشی کے منہ پر سیاہی کھر گئی تھی اور ماتھے پر ایک بڑے سے قرسزی دھبے میں سے پسینہ کے قطرے بے تحاشہ اُڈ رہے تھے۔ بازار سے ملے کر

گھر تک اس کی بیوی لگنت بھری باتیں کرتی رہی ————— اور تن
اس کی ایک بات کا بھی مطلب نہ سمجھا اور جب اس نے ٹانگے پر سے ہاتھ دے کر
درشتی کو اتارا تو اسے معلوم ہوا کہ درشتی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے
اور چونکہ وہ عورت کے سیدھے سادے قسمل کی ایک کڑی کھو میٹھا۔ اس نے مرد
کی دیرینہ عادت کے مطابق کتنا شروع کیا ————— عورت ایک صفا
ہے۔ شوہنہار کتنا تھا
.....

اگلے دن درشتی سو کر اٹھی تو آٹھ کی بجائے آٹھ پینتیس ہو چکے تھے اور سوچ ان
کے دیکھ پر آگیا تھا اس کی شعاعیں کلاک کے شیشے میں سے منعکس ہوتی ہوئی درشتی
کے چہرے پر پڑنے لگی تھیں۔ کلاک کے بڑے بڑے رومن ہندسوں میں خالی سفید
جگہ بڑے بڑے دانت بن گئی تھی۔ یوں دکائی دیتا تھا جیسے شکیلو شاطر کی حد سے گزر
چکا ہے اور کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔

..... اور شکیلو شاکیلہ ہی نہ تھا۔ اس کے ساتھ لگو کی ماں بھی تو شریک ہو گئی
تھی۔ لگو کی ماں تن کے ہاں طارز تھی وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ بیچ جب وہ چائے سے
کڑائی تو رانی جی کو یوں تھکے تھکے دیکھ کر غمی غمی..... غمی غمی کے انداز سے ہنسنے لگی۔
گویا کہہ رہی ہو ہم بھی بہت دن گئے جاگاتے تھے۔ ہماری آنکھوں میں بھی خمار ہوا
تھا اور اب تو راتوں کو سجانے والے بھگوان کے دوارے ہی پے گئے آہ! مجھے
وہ دن یاد ہے جب وہ میرے لیٹنے کے لئے بہت سندر گڑا اور گنگری لائے تھے —
— اس دن تو وہ پہلے اندر ہی نہیں آئے۔ دروازے پر ہی کھڑے سکراتے رہے

گروہن

اور جب اندر آئے تو ان کا بات کرنے کا ڈھنگ بھی عجیب تھا اور وہ گونڈا دیکھ کر میری
جب بٹکان اتر گئی تھی۔

درشی نے چلاتے ہوئے کہا: گلو کی ماں!

گلو کی ماں کے لبوں پر قسم نہیں رہا۔ صرف اس کا سید رہ گیا، اہلی سہی سرخی سے
اس کا رنگ سیدھی اور سپیدی سے زردی اور سیاہی مائل ہو گیا اور وہ حیرت سے
کلا کی ٹک ٹک کو سننے لگی۔ درشی کے لئے وہ معمولی ٹک ٹک تھوڑے کی ضربوں
سے کم نہ تھی۔ ہستاد کی عزت محفوظ خاطر نہ ہوتی تو وہ پتھر مار کر اس کی ٹک ٹک کو روک
دیتی۔ گلو کی ماں سوچ رہی تھی کہ آخر مالکن کیوں خفا ہو رہی ہے حالانکہ رتن
بابو نے اسے ایک نئی ساڑھی خرید کر لا دی ہے جس پر پورا ایک ہاتھ پوڑا طلائی
باڈر لگا ہے اور اس کے انداز سے کے مطابق اس کی تمام تھکاوٹ دور کر دینے
کے لئے کافی ہے۔

درشی نے کہا: ”آج پھر تو نے مجھ بھر چائے کے پانی میں وہ دھوکا گارنڈیل دی“
گلو کی ماں نے سہمے ہوئے کہا: ”رتن بابو نے کہا تھا، رانی“
”کیا کہا تھا انہوں نے؟“

”کہا تھا — رانی بیمار ہے“

گلو کی ماں نے رے اٹھائی اور آنکھوں سے ایک ہاتھ پوڑے طلائی باڈر
کو دیکھتی اور دل میں جھگو ان کو گھسیٹتی ہوئی چلی گئی۔ درشی سوچنے لگی کیا رتن کو اس کی
کمزوری کا پتہ چل گیا ہے؟ اسی لئے تو وہ اس قسم کی چائے کو میرے لئے غیر مفید سمجھنے
لگا ہے اور کیا معلوم جو اس نے سوتے میں میرے پیٹ کی تلاش بھی لی ہو۔ اس نے

زندگی سے ایک ہاتھ سرنانے کے نیچے مارا بیگ وجود تھا اور تھا بھی جوں کا توں بند۔
 بیگ کے ایک کونے میں جھوروں کی ایک جوڑی بڑی تھی درشتی
 جھوروں کی بہت شوقین تھی لیکن اس کے بیاہ میں جتنے بھی زور دیتے گئے تھے وہ
 سب کے سب وزنی تھے اور وہائی طرز کے بنے ہوئے۔ اکیلے جھور ہی ڈیڑھ تولہ
 کے ہتے۔ ورثی مانتی تھی کہ رتن ان بے جھوروں کو چنے ہوئے دیکھ کر بہت عوٹ
 ہوتا ہے۔ وہ خود بھی رتن کو خوش رکھنا چاہتی تھی لیکن اس بات کا کیا علاج کہ وزنی
 جھور پھٹتے سے اسے اپنے کان ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور وہ نہیں نصت
 گھنٹہ سے زیادہ دیر تک نہیں پہن سکتی تھی۔

پر یہ ورثی کی خواہش تھی کہ وہ بکے سے جھور خرید لیتی۔ یہی کوئی کسنتی سی جوڑی۔
 لیکن ان کے لئے وہ رتن سے پیسے نہ مانگے گی، تاوقتیکہ وہ خود اپنے فرض کو محسوس
 کرتا ہوا پیسے اس کے ہاتھ میں نہ دے۔

معاً اس کا خیال پا پا کی طرف چلا گیا۔ ان سے تو وہ پیسے لے کر بھی آگ لیتی تھی۔
 کسی خیال کے آنے سے ورثی اٹھی اور اپنے ہی کمرے میں جب اس نے الماری
 کھولی تو اس کی جاکٹ کی ساڑھی کے اوپر رتن کا کوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ . . . ورثی
 کے منہ پر ایک سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سوچا تمام مرد ایک ہی سے لا پرواہ ہوتے
 ہیں۔ یہی مردوں کا بوجھ ہے اور پھر زمانے میں مٹی کوٹ یا جاکٹ کی ساڑھی کے اوپر
 اپنا کوٹ شاید عموماً بھول جانے کا کیا مطلب نہیں کہ اس کوٹ کے ساتھ جیسا سلوک
 مناسب سمجھا جائے، کیا جائے گویا کوٹ زبان حال سے کہہ رہا ہو میں نے تجھے مسل
 ڈالا ہے، تو اس کے عوٹ میں میری جیبیں کاٹ ڈال، ورثی نے دروازے پر نظر

گھاڑے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں دس دس کے چار نوٹ اور کچھ بڑی گاری
آگئی۔ اس نے سوچا اگر وہ اس میں سے ضرورت کے مطابق کچھ اڑائے تو رتن کیا
کھے گا..... لیکن..... پوری تو ایک ذلیل حرکت ہے.....
ابھی تو روحوں کا غلاب نہیں ہوا..... وہ یوں جیب میں سے پیسے
اڑا کر میسوائے کھلائے گی؟

دو تین دن تک ورشی کو ہنری پال پور اپنے مریعوں سے یذریجہ تار سو روپے
آپکے تھے ٹیگن کے اور روپے اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے بہت حد تک ورشی کی معصی
کمزوری کو آرام پہنچایا۔ لگو کی ماں بھی خوش تھی اور بھگوان کو کم یاد کرتی تھی۔ ورشی نے کئی
مرتبہ رتن کو کہا کہ بازار جا کر برساتی کوٹ خرید لینا چاہئے۔ برسات کے بعد اس کا کیا
فائدہ ہو گا۔ لیکن چند دنوں سے رتن لال اپنے دفتر میں اسمبلی کے لئے ہند سے تیار کر
رہا تھا اور اس کے لئے اسے بارش ٹو مہوپ، ساڑی کسی چیز کی پروانہ تھی اور اس
بات نے ورشی کو بہت غمگین کر دیا تھا۔

ایک شام رتن گھر واپس آیا تو ورشی کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ اس کے ہاتھ میں
جھومروں کی ایک بوڑھی تھی۔ جو تھی بھی بہت ہلکی اور جدید فیشن کی۔ ورشی خوش نہیں ہوئی
کیونکہ وہ جھومراں نے خود نہیں خریدے تھے۔ رتن نے انہیں اپنی خاطر خرید ا تھا۔
وہ خود بھی تو اسے جھومر پہنے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ پس تو یہ ہے کہ مرد بھی
عورت کی فرمائش پر زیور خریدنا پسند نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنے لئے سجانے کو بیڑتے
ہیں۔ ورشی کو تسکین ہوئی بھی تو مضمض اسی سے کہ رتن انہیں خود بخود خرید لایا اور ایسا

گرمین

کرنے میں اس نے اپنی نرمی شناسی کا ثبوت دیا۔
 جھومروں کی جوڑی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ طنز یہ انداز سے بولی۔
 ”ختم ہو گئے آپ کے ہندسے؟“
 ”ختم ہو گئے۔“

رتن نے درشی کا ہاتھ پکڑا تو اس نے جھٹکے سے چھڑایا۔ بولی ”اب میرے
 ہندسے شروع ہیں۔ سروباں آنے والی ہیں کم سے کم نین بھینچوں کے موٹیر بننے ہیں“
 رتن نے پھر ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ”تو کیا تمہیں جھومر پسند نہیں؟“
 ”جھومر؟ — اوہ! ہاں“ درشی منہ پھلاتے ہوئے بولی ”آپ
 نے بہت تکلیف کی۔“

ٹیکو شاہ سنور سکرار ہاتھا۔ وہ محض ایک کلاک ہی نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹے متواتر
 ہلک ہلک، ہلک ہلک کہنے والا۔ وہ درشی کا استاد بھی تھا۔ جس کے ڈائل اور موٹیوں
 نے درشی کو ایک اچھی لڑکی کے طور پر دیکھا تھا اور اب شاید ایک اچھی بیوی کی
 صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

رتن پہلی کڑی کھو دینے سے منزل مقصود پر نہ پہنچ سکا۔ وہ درشی کے باتوں
 میں طنز و پارک تو وہ بولی۔

”آپ تو یونہی میرے لئے پیسے برباد کرتے ہیں — بھلا اور بھی
 کوئی ایسے کرتا ہے؟“

رتن پچھتی پچھتی آنکھوں سے درشی کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اگر
 درشی اسی وقت وہ جھومر اپنے کانوں میں نہ ڈال لیتی تو دنیا کی تاریخ کی اور بیڑی وحب

گرمی

سے لکھی جاتی۔ اس نے نہ صرف جھومر پہنے بلکہ اپنی گردن کو عجب انداز سے ادا ہر ادا ہر ہلا دیا اور رتن ایک ایسا انداز آدمی کی طرح اس کی گردن اور اس کے ہلتے ہوتے جھومروں کے متعلق سوچنے لگا۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی تک درشتی کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ بولی۔
 ”کیا لاگت آتی ہے اس پر؟“
 ”کوئی بہت نہیں۔“

”تو بھی“

”سارے اکتیس روپے۔“

درشتی نے اپنے سابر کے بیگ کو ٹوٹن شروع کیا۔ رتن ایک لمحہ کے لئے متشکک گیا۔ وہ شاید اس بات کو مذاق سمجھ کر جانے دیتا لیکن درشتی کے ہرے نے اسے مذاق کی حدود سے بلند و بالا اٹھا مارا تھا۔ کچھ دیر بعد رتن نے اندھیرے میں اپنے پاؤں تلے زمین محسوس کی۔ گویا کوئی کھوئی ہوئی کڑی اس کے ہاتھ آگئی ہو۔ اس نے اپنی جیب میں سے تمام نقدی نکالی اور اندھیرے میں درشتی کے قدموں پر رکھتے ہوئے بولا ”تم اس دن اپنی ضرورت کا ذکر کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ لہذا یہ اپنی مرضی سے خرچ کر لینا۔“

درشتی نے ایک ثانیہ کے لئے سوچا۔ رتن نے ایسا کرنے میں عورت کو سب سے بڑی گامی دی ہے۔۔۔۔۔ ”میسوا!“

بیابان کو ایک دو سال گزر گئے لیکن دونوں کی رگوں میں کوئی خاص تبدیلی

نہیں آئی۔ بلکہ رتن اب کچھ کچھ کچا سا رہنے لگا۔ اس عرصہ میں درشی بیوی کے تمام ہنر سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ جسکس دیسے ہی تھی۔ آج تک اس نے کھلے بندوں رتن سے پیسے نہیں مانگے تھے۔ وہ بہا اوقات اپنی کمزوری پر اپنے آپ کو کوسا کرتی عموماً یوں ہوتا کہ بچے کے فراک یا اسے کیلشیم وینے کا ذکر ہوتا تو وہ فریسیے مل جاتے اور پھر رتن اس کی ضرورت اور اپنے شوق سے متاثر ہو کر خود بھی اسے کچھ نہ کچھ لاد دیا کرتا۔ ہری پال پور میں آنا جانا جیسا ہی ہوا تھا۔ اگرچہ درشی کی ماں سوتیلی تھی۔ باپ تو سوتیلہ نہیں تھا۔ بڑا بھائی ایگزیکٹو انجینئر ہو چکا تھا اور پھر دفتر اور ہندسوں کے بعد رتن کا کوٹ اس کے مٹی کوٹ پر لٹکا ہوتا۔

اس ایک دو برس کے عرصہ میں شیکو شا کا چہرہ قدر سے پیلا ہو گیا تھا۔ اس کی کھانوں میں وہ پہلی سی شرارت اور طنز آمیز مسکراہٹ نہ رہی تھی کبھی کبھی اس کا کوئی پرزہ خراب ہو جاتا تو اس کی مرمت کر دی جاتی۔

ایک دن رتن لال شب کو کسی دوست کے ہاں ٹھہر گیا۔ صبح واپس آیا تو درشی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”آج صبح میں نے ایک واقعہ دیکھا۔“

درشی نے بچے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا ”کیا دیکھا ہے آپ نے؟“

رتن بولا ”میں کہتا ہوں۔۔۔۔۔ یہ بازار میں عورتیں کتنی بے حیا ہوتی ہیں۔“

آج میں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا۔ جس کے بال اُبلے ہوئے تھے۔ جس کی آنکھیں خمار آلودہ تھیں۔ جسم سے بیمار و کھائی دیتی تھی۔ صبح صبح بازار اس نے ایک بابو کو لارے پر لٹا ہوا تھا اور پیسے مانگ رہی تھی۔ وہ بابو بے چارہ کوئی

گرمی

بہت ہی شریف آدمی تھا۔ وہ چھپتا تھا، چلاتا تھا۔ کہتا تھا میں نے بس ایک خوبصورت ساڑی لاکر دی ہے۔ گر لگاؤ ہو کر دی ہے اور اب پیسے طلب کرتی ہے۔

وہ بے غیرت بھروسے بازار میں کھڑی تھی کہ وہ تو سب جن کی نیاز ہے اس نے اپنے لئے مجھے وہ ساڑی پہنائی تھی۔ اپنے لئے گر لگاؤ جیسے پہن کر میں اس کے ساتھ لارنس باغ کی سیر کو گئی۔ لیکن مجھے پیسے پائیس۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے، مجھے اپنے بچے کے لئے کپڑے پائیس! میں نے کرایہ دینا ہے، مجھے پونڈر کی ضرورت ہے۔

اور اس کے بعد رتن جھننے لگا۔ بڑے معنی اب بے مطلب تھی، اور اس عرصہ میں اپنا سٹوٹوں سے بھرا ہوا کالہ چھپاتا رہا جس بات کو سن کر درشی کی ساری طبعی کمزوری واپس آ گئی۔ درشی نے محسوس کیا اس میں جتنی کمزوریاں تھیں وہ جیسوا میں مفقود تھیں۔ وہ اس کے جسم کا بقیہ حصہ تھی جسے اپنے آپ میں محسوس کرتے ہوئے وہ ایک مکمل عورت ہو گئی تھی۔ درشی نے سر سے پاؤں تک شعلہ بنتے ہوئے کہا۔

”وہ بالہ باجی آدمی ہے — کمینہ ہے۔ اور وہ جیسوا کسی گڑبست سے کیا بری ہے؟“
رتن لال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے درشی کے پھر سے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو تمہارا مطلب ہے — اس جگہ اور اس جگہ میں کوئی فرق نہیں؟“
درشی نے اسی طرح پھر سے ہونے کہا ”فرق کیوں نہیں۔ یہاں بازار کی نسبت شور کم ہوتا ہے“

— لاک کی ٹک ٹک بند ہو گئی۔ رتن لال سوچنے لگا۔ ”خوبصورت سچ پرچ ایک ممتاز ہے اور شو پنہار نے۔“

دوسرا کنارہ

(ناول سے ملخص)

لکھاڑی کے اس کنارے ڈھوک عبدالاحد کے ایک منگلاٹھیلے پر کھڑے ہونے سے دوسرا کنارہ بہت دور ایک دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ دوسرے کنارے پر اور اس سے پرے کیا ہے، اس کے متعلق ہم قینوں بجائیوں میں سے ایک بھی نہ جانتا تھا۔ اس پار احد تنگا سے درے، ایک فقری سی ٹہر، راج کی شعاعوں میں چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جو کہ فوراً ہی دھند کی لطیف چلن کے پیچھے غائب ہو جاتی وہ لکیر غالباً پانی کی ایک ندی تھی جو کہ ڈھوک عبدالاحد کے شمال میں لکھاڑی سے عیدہ ہو کر دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ بہ رہی تھی۔

دوسرا کنارہ ہمیشہ پراسرار ہوتا ہے اور انسان کا مطلع نظر انسان ہمیشہ پہنچ سے باہر چیز کا شائق ہے۔ اس کی زندگی کے بہت سے رومان کا فلسفہ بھی یہی ہے۔

زندگی کے دوسرے کنارے پر کیا ہے؟ یہ زید جانتا ہے نہ بکر، راستہ میں موت
حائل ہے۔ اور ڈھوک عبداللہ کے قبضے میں کھڑے ہو کر دکھائی دینے والے دوسرے
کنارے پر کیا تھا؟ ہم نہیں جانتے تھے۔ راستہ میں موت کی ہی ذخار کھاڑی حائل تھی۔

حق تو یہ ہے کہ اسی کھاڑی نے ہماری محنت کش، نزع کی سی زندگی میں
ودمان پیدا کر دیا تھا اور ہمارے تصور میں ایک ہلکی سی رنگ آمیزی ہو گئی تھی۔
اس خوب صورت نیلا ہٹ کی مانند جو سفید براق کفن کی تھوں میں دکھائی دیتی ہے
بسا اوقات جب میں میٹری کے دوزخ نہا چھوٹے میں سے اسخوی ڈبل روٹی نکالتا
تو فوراً ڈھوک کے سنگلاخ پیٹے پر جا کھڑا ہوتا۔ اور مستفسرانہ نگاہوں سے فیری بوٹ
میں سے اترنے والے مسافروں کے رنگ و پچاں ڈھال وضع قطع کا معائنہ کرتا۔

کبھی کبھی قبضے کے میٹر کے بڑے مرغی خانہ کے لئے دوسرے کنارے کی طرف
سے بڑے بڑے یلگ مارن رزا اور مرغی سی مرغیوں سے جنت کرنے کے لئے منگواتے
جاتے اور یہاں سے بڑے بڑے دفنی اندڑے اس پالے جانے کے لئے ٹوکریوں میں
بند کئے جاتے۔ ہماری بیکری کی روٹیاں اسی فیری بوٹ میں لے جاتی جاتی تھیں، ہمارے
باپ نے فیری کے مالک سے سال بھر کا ٹھیکہ کر رکھا تھا۔ وہ خود کئی دفعہ دوسرے کنارے
پر گئے تھے اور اکثر اس پار کے دلچسپ قصے ہمیں سنایا کرتے تھے۔

ایک دن میں چوٹھے کے پاس بیٹھا، پسینہ میں شرابور خمیر سے اٹنے کی ٹھیکیا لیا
۔ بخار لگتا تھا۔ تو سندھ میرا بڑا بھائی آیا۔ رہ ٹھیکین ساد دکھائی دیا تھا۔ اندازے ہی
اس نے قریب پڑا ہوا پانی کا ایک گلاس اٹھایا اور پی لیا۔ پھر سنگترہوں کے سونکھے
ہونے پھلکے اٹھائے اور کسی گری موچ میں مستغرق، ان چھپکوں کو خمیری ٹھیکوں پر

چپکانے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:

”تھکیلدار آیا ہے، نیا تھکیلدار۔۔۔۔۔“

میں زیادہ تیزی سے ٹکیاں بنانے لگا۔ خمیر سے اسٹے کے ایک ٹکڑے کو میں نے ہوا میں اچھالا۔ وہ گول گول پکڑا ہوا میرے ہاتھوں میں گرا۔ یہ میں اس لئے کیا کرتا تھا کہ میرے دوزخی کام میں کچھ لمبی پیدا ہو جائے۔ لیکن کیا اس سے سیکری کے چھٹے کی تمازت کم ہو جاتی تھی اور آگ میرے لئے اپنی فطرت کو خیر باد کہہ دیتی تھی؟

سبب میں نے سمندر کی بات کو زبنا۔ تو اس نے جو کی کو میرے قریب سر کایا اور میرے کندھے کو چھوتے ہوئے بولا:

”تم نے سنا؟ تھکیلدار آیا ہے“

میں نے جھٹلا کر سمندر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”تو پھر بہت سی روٹیاں دو کار ہوں گی۔۔۔۔۔ ہے نا؟“

سمندر نے اپنے بازو اوپر اٹھائے اسیس کو اتار کر بہت دور کھاٹ پر پھینک دیا

اور دو تین خمیری روٹیوں پر سنگتر سے کاچھلکا چپکاتے ہوئے بولا۔

”رجو۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتے علمو کو؟ وہ میرا لگوٹیا یا رننا۔ ایسے ملو نہ کہنا۔

وہ اب خان صاحب علم اندین ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ اور بڑھوک ہی میں تھکیلدار ہو کر

آیا ہے، آج سال ہوئے وہ کھاڑی کے ہی طرف گیا تھا۔۔۔۔۔“

میں نے اسی وقت خمیر سے اسٹے کو ملن چھوڑ دیا اور حیرت سے سمندر کی باتوں کو

سننے لگا۔۔۔۔۔ بہت سی باتیں سنانے کے بعد سمندر اپنے ہاتھوں سے انڈوں

کے چھلکے اکٹھے کرنے لگا۔ سمندر کی باتوں میں کچھ خلش تھی اور اضطراب — علمو اب

خان صاحب علم الدین ہو چکا ہے اور سند راہی وہیں بھارت بھونک رہا ہے۔ اس بات میں سیکری کی آگ سے زیادہ جلن تھی، سند کے لئے

دو تین دن تک سند بہت خاموش رہا، جب وہ بھارت کے قریب بھگ کر پڑے تو بچے سے چولہے میں پڑی خمیری روٹی کو نکالتا تو کچھ سوچ میں غرق ہو جاتا ایک دن بہت سی ٹکیاں جل گئیں، اس دن جہان باب بہت غصے ہوا اور اس نے ایک بٹلی سی بیت کی چھڑی سے سند کو پیٹ ڈالا، وہ بیت کی چھڑی اسی مطلب کے لئے پانی میں بھگوئی جاتی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ عبرت ناک سزا دی جاسکے۔ بابو کے برابر کا ہونے کے باوجود سند عموماً اس مار کو خاموشی سے سہہ لیا کرتا تھا۔ بابو سند کو مارتا تھا اور کہتا تھا۔

”بڑا تحصیلدار بنا پھرتا ہے۔۔۔۔۔ حرام کار۔“

اس وقت ہم دونوں تینوں بھائیوں کی نگاہیں اس پار چلی جاتیں جہاں سے تحصیلدار بن کر آتے تھے، جہاں ’دن میں شکل سے ویں درجن روٹیاں بنانے والا سیکری کا مارک ہمیں بھیجے گا اہل نہیں تھا، لیکن جب ہم تحصیلدار بنتے تو ہمیں پٹا کرتا اور بال بھی فروخ لیتا۔ ہمارے زخموں کو سینکٹ اور پھر مار کو زخمی کر دیتا

ہم بچپن سے سنتے آئے تھے کہ اس پار بڑی دولت ہے جو کوئی بھی جاتا ہے مالدار ہو کر آتا ہے۔ وہاں بڑے شہر میں ایک جوٹا بسٹی ہے جہاں تحصیلدار بنانے کی ایک کل رکھی ہے۔ کلکٹر بھی شاید اسی میں سے نکالے جاتے ہیں۔ ڈھوک عبد اللہ اللہ کے داروغہ صفائی جو ہر روز ہماری روٹیوں میں نقص مینی کرتا ہے۔ اسے ہی چھو کر آیا ہے جب ہم نے ٹیلے پر سے کھاڑی کی طرف دیکھا تو ہمیں پاؤں کے نیچے فیری

آہستہ آہستہ پھلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ اس میں سفید سفید اندلوں کے ٹوکے ٹیلے پر سے موتیوں کی ڈبیروں کی مانند دکھائی دیتے تھے اس کے علاوہ آنکھ پر ہاتھ رکھنے سے دُور، ایک نقرئی سی لکیر نظر آتی تھی جو کہ سورج کی روشنی میں چمکتی ہوئی فوراً ہی ایک دھند کے پیچھے غائب ہو جاتی تھی۔

ہر سال پوہ ماگھ کے مہینوں میں ہمیں دو تین سو کے قریب روٹیاں روزانہ نکالنی پڑتی تھیں بہت سے شگرتوں کے چھلکے اسکاٹھانے ہوتے۔ پان سات بوریاں میدے اور آٹے کی اٹھواںی ہوتیں۔۔۔ پیسے یسجن کے بعد چکاویے جاتے تھے مان مہینوں کو باپو یسجن کے چھینے کہا کرتا تھا جس طرح اسقاط اور امٹرا کی مرلیضہ مخصوص چھینے کو خوت سے ”اُن گنا“ کہتے ہیں اسی طرح ہم یسجن کو اُن گنا کہا کرتے تھے۔
سننے ہیں کھاڑی کے اس پار ایک بڑے سے گھنٹہ گھر کے ارد گرد سینکڑوں ہزاروں صاحب لوگ رہتے تھے۔ ان دنوں ان کا امید ہوتا تھا۔ جسے وہ لوگ کوکس کہتے تھے۔ جس میں مرد و عورت ملے ہو کر ناچتے تھے۔ تب بڑا مزہ ہوتا تھا اور۔۔۔ ہمیں سینکڑوں روٹیاں نکالنی پڑتی تھیں۔

یسجن کی بات ہے۔ باپو نے ایک دن ہمیں اس شرط پر جمی و سے دی کہ نیری کے دوسرے پھیرے پروں کی تمام روٹیاں دباں پہنچاوی جا دیں ہم نے جلدی جلدی روٹیوں کو بھاڑیں سے نکالا اور ٹوکریوں میں ڈال کر فیری کی طرف چلے گئے۔ اس دن آسمان پر ایک ٹیالی رنگت چھائی ہوئی تھی۔ ہمیں آندھی کی توقع تھی۔ پوہ ماگھ کے چھینے میں ڈھوک عبدالاحد میں آندھیاں آہتی ہیں۔ فوراً سی تیز ہوا یا ٹولا

گرم

چلنے سے کھاڑی کے شمال کی طرف پڑی ہوئی مسینکڑوں میں ریت آسمان پر چڑھ جاتی ہے۔ اس دن تندہوا پانی میں لہروں کے جذبات پیدا کر رہی تھی۔ کبھی کبھی ایک اچھال سی آتی اور پانی ہمارے ٹھنوں میں ٹوٹا ہوا بہت سے ٹھونگے اور سبز جالا چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ کبھی کبھار اچھال کے ساتھ کوئی لمبھی کنارے پر رہ جاتی اور پانی کے لئے مضطرب خشک ریت کی زمین پر تڑپنے لگتی۔ لوگ دوڑ کر اسے کڑ لیتے اور وہیں بھون کر کھا جاتے۔

فیری دھیمے دھیمے ہچکولے کھاتے ہوئے کنارے پر آئی۔ اس میں تھے عیدلار
سجوت و ربوق اترنے لگے۔ ان لوگوں میں کچھ جان پہچان کے تھے اور کچھ ناواقف
دو ایک ٹی فوریلک کے ملک تھے جو بدوق کلاس لینے کے لئے اس پار گئے
تھے۔ اس کے بعد ایک بڑا سا ڈوب اترتا۔ جس میں سے ٹھٹھک، ٹکڑوکی آوازیں
آ رہی تھیں۔ غالباً بیکر کے صبح مرغی خانے کے لئے مزید لیگ ہارن منگواتے گئے تھے۔

اس وقت باپ بھی آگیا۔ فیری کے مالک سے سال بھر کے کرائے کا فیصلہ کرنا تھا۔ بہم سب کی نظریں فیری کے کونے میں مٹی ہوئی میم صاحب پر جم گئیں۔ اس کا حسن سب کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ میم صاحب کے سر پر ایک ہلکی سی کاسے سلک کی ٹوپی تھی۔ جیسے اڑ جانے کے خوف سے اس نے مری بازوؤں سے تمام رکھا تھا۔ مگر میں بڑی ہوئی پیٹی اور اٹھے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے چھاتی کا بھارا ایک چٹان کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ معا میرا خیال اپنی بجاوجہ کی طرف چلا گیا جس کی چھائیاں کسی مرد سے ہوئے مرغ کی گروں کی طرح لٹک رہی تھیں۔ سندھ کا بیابان ہوئے ابھی مشکل پانچ سال ہوئے ہوں گے کہ مین بچوں کی پیدائش نے بھابی کی صحت کو غارت کر دیا تھا۔

گرمی

..... اور ہم صاحب نے ایک ریشی چینٹ کا گون پہن رکھا تھا جو کہ اس کے جسم کے تمام عناصر کی وضاحت کر رہا تھا۔ ننگے بازو، ڈبل روٹی سے بھی زیادہ نرم ستھ اور خوب صورت اسٹڈل پنڈلیاں باقی و انت کی بنی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ یا شاید وہ خوشگفتہ نہیں تھیں جن کے سر سے پر پاؤں کے دو گلابی کنول کھلے ہوئے تھے۔
معافیہ کی کے مالک نے کہا۔

”خان کی بیوی ہے، ولایت سے۔۔۔۔“

”کون خان؟“ باپو نے متحیر ہو کر پوچھا۔

”تحصیلدار صاحب!“

سندر نے پلٹتے ہوئے کہا: ”ارے ملو کی۔۔۔۔۔“

باپو نے غصے سے سندر کی طرف دیکھا اور و انت پیٹتے ہوئے بولا: چپ

رہو۔۔۔۔۔ سزا کار۔“

میں نے دل میں سوچا۔ ولایت سے آئی ہے لیکن ولایت سے تو لیگ ہارن نژاد مرغا آتے ہیں۔ مگر لیگ ہارن مرغیان آجائیں تو کرن منع کرتا ہے۔ پھر آج کل میلے کے دن ہیں۔ خان صاحب کو لینے آئی ہوگی اور کوئٹہ کے میلے میں یہ لوگ گھنٹہ گھر کے ارد گرد ننگے ناپیں گے۔ یہاں کم بخت و صوبہ میں ان کو کون ناپیٹھ دے گا۔ ان پر پول تحصیلداروں کے لئے وہی جگہ مناسب ہے۔ اس باراد و سرے کنارے پر۔۔۔۔۔

اس دن شام کو ہم اداس خاطر ہو کر واپس لوٹے مگر آتے ہی سندر نے اپنی پرانی پڑی کو پھاڑا، حلیم کو صاف کیا، نیا تھمد باندھا اور و صوبہ کے چوپال کی طرف چلا گیا۔ وہاں چوپال میں بہت سے لوگ آکر بیٹھ جاتے تھے۔ صبح کو باوا کا نوکر میل اور بڑا کی

گھر میں

گولروں کو موات کر جاتا اور ایک خستہ سی دیوار کے نیچے بڑی سی کھوکھلی میں بہت سے اُٹے سلگ کر چلا جاتا۔ اسے اس کام کا ثواب خاص خدا کی درگاہ سے ملتا تھا، وہاں بیٹھ کر سندر نے تحصیلدار کو جی بھر کے کوسا اور خاں صاحب کی بیوی کی بے حیائی کا تذکرہ کیا۔

اس دن ماں نے بھابی لکھمی کو ہدایت دی کہ غمیرے اُٹے میں ڈالے جانے والے انڈوں کو گندے انڈوں سے علیحدہ کر دے۔ اس دن بھابی لکھمی کو فرمت نہ ملی ننھے بچہ کے گلے میں ایک بڑا سا پھوڑا نکل آیا تھا۔ جسے دکھانے کے لئے وہ ڈھوک کے سب سے بڑے جوتے کے پاس چلی گئی اور جوتے کے بے وقت پیر ڈالنے سے وہ پھوڑا نہایت خوفناک شکل اختیار کر گیا۔ لکھمی بچہ کو گوری میں ڈالے سارا دن روتی رہی۔

اگلی صبح جب ہم تینوں بھابی کام کر رہے تھے۔ تو پاؤں پر کھجور لگایا دیا گیا اور سندر کو مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”تم نے انڈے دیکھے تھے؟“

”لکھمی کے سپرد کئے تھے“

”اس حرام کار کے سپرد؟“ اس نے پانی میں ہی ڈال کر نہیں دیکھے،

نصف انڈے گندے رہے ہیں نصف، من رہے ہو، میں یہ خسارو تمہارے باپ سے، تمہاری دادا سے پورا کو دل لگا، سو رکے بچے

سندر نے ذرا تیز ہوتے ہوئے کہا۔

”بچہ مر رہا ہے اور آپ کو انڈوں کی پڑی ہے۔ یہ رہے الے جلیے لپٹے انڈے

وندے ”
 باپو نے سندھ کی بات کو نہیں سنا اور بولتا چلا گیا۔ آخر میں ایک چٹا اٹھا کر
 سندھ پر چٹیک دیا۔ اس کی آنکھ بال بال بچی۔ باپو بولا۔
 ”بھئی میم ہے نا..... اسے کرسی پر بٹھا چھوڑنا چاہتے، کیوں؟“

سندھ کی بھاتی غصے سے بھرنے لگی وہ بال بچوں والا ہو چکا تھا۔ پھر بھی باپو سے
 ماننے سے نہیں چوکتا۔ اس نے شعلہ نلگن آنکھوں سے ایک مرتبہ باپو کی طرف دیکھا اور
 پھر بڑے چوٹے میں دھکنے والی ڈبل روٹیوں کی طرف اور وہی چٹا اٹھا کر
 ڈبل روٹیاں نکالنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے انڈوں کے لعاب میں انگلی ڈالی اور مٹھا
 ہی اس کی نظر کھاڑی کے اس پار اٹھ گئی۔ جہاں سے سمیں آتی تھیں۔ جن کی
 پھاتیاں چٹان کی طرح ابھری ہوئی ہوتیں۔ جن کے جسم پر بھینس کر آئے ہوئے گون
 ان کے جسم کے ایک ایک عنصر کی دفاعت کرتے۔ ننگے باز ڈبل روٹیوں سے بھی
 زیادہ نرم ہوتے اور پاؤں ہوا کی سی ہلکی سینڈلوں میں کنول کے پھول کی طرح

موٹی موٹی ڈبل روٹیوں، بسکٹوں اور سال میں بارہ مہینے دہکتے ہوئے دوزخ سے
 فرار کتنا جانتا تھا؟ سندھ کی گتیاں بہت زیادہ بیدار ہو چکا تھا۔ فیری کی نت نئی
 پیداوار نازیانہ بن جاتی تھی۔ وہ اکثر پانی میں ڈوبل ہوئی بیت کی چھڑی اور دوسرے
 کنارے پر تپلی سی پانی کی ٹیکر کو بیک وقت دیکھا کرتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا جب
 سندھ نے باپو کے سامنے دوسرے کنارے پر جا کر قسمت آزمائی کرنے کا عزم پیش
 کیا اور آخر ایک دن ہم سب لوگ نئے سین کے بھاری کام سے فارغ ہو کر کھاڑی

گرہن

کے کنارے پر جامو جو دہرے۔ اس دن بھی کھاڑی میں طوفانی کیفیت تھی۔ بڑی بڑی لہریں
 فیری کتھیرے مار رہی تھیں۔ کچھ ماہی گیر اپنے بڑے سے جال کو گھسیٹ کر کشتی کے انبار پر
 پھینک دے تھے۔ اس کے بعد انڈے لارے گئے۔ بڑے بڑے، وزنی انڈے جو لہریں
 مریخوں نے لیگ مارن مروں سے جھنٹ ہو کر دیئے تھے۔ اس کے بعد ہٹو ہٹو کی آواز
 آئی اور ہم نے دیکھا تحصیلدار صاحب کا خانساں اکرم جو ہمارے ہاں سے روز ٹول
 روٹیاں لے جایا کرتا تھا۔ کسی چیز کو ایک خوبصورت شال میں لپیٹے ہوئے فیری کی طرف لایا۔
 کچھ دیر بعد اس شال میں سے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی ہمیں تپہ چلا کر دیکھنا
 کا لڑکا ہے۔ جو تین چار دن ہوئے میم صاحب کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ میں اسے اپنے
 منہ بھلے بجائی کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے اونچا ہو کر دیکھا۔ بچہ نہایت خوبصورت اور
 تندرست تھا۔ اس کے منہ پر گلے کے قریب ایک بہت لمبی سی پھٹی نکل آئی تھی۔ اور
 اسے مرحم پٹی کے لئے دوسرے کنارے پر بڑے ہسپتال میں بھیجا جا رہا تھا۔

سندر نے فیری پر قدم رکھا۔ اس سے پہلے ہمارے گھر میں سے کوئی بھی آدمی
 رخصت نہ ہوا تھا۔ چار پانچ مہینے کے لئے بھی نہیں اور آج یہ بھائی نہ جانے کتنی مدت کے
 لئے مجھ سے جدا ہو کر اس پار جا رہا تھا۔ چند روز پیشتر ایک مرحمت طلب گھڑی کی
 بابت سندر اور مجھ میں بہت سرسپٹول ہوئی تھی اور آخر وہ گھڑی میں نے اسے نہ
 دی۔ آج جب میں نے غور ہی وہ مرحمت طلب گھڑی اپنے رخصت ہوتے ہوئے بھائی
 کے کپنتے ہوئے ہاتھوں میں سے وہی تو اس نے انکار کر دیا۔ بولا۔

”راجو ابھیار کھو اے قمر۔“ تم مجھ سے چھوٹے نہیں ہو کیا؟
 ”نہیں تمہارے لورے سندر یہاں سے اصرار سے کہا۔

گرھن

”جہانے بھی دو“ سندربولہ! تمہاری لکائی پکنسی خوب مورت دکھائی دیتی ہے۔
اے لکاش! میرے پاس کچھ اور بھی ہوتا۔ جسے میں اپنے چھوٹے بھائی کو نصرت
ہوتے ہوئے دیتا۔“

میں نے زبردستی دھکڑی اپنے بھائی کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا: ”اسنے
بڑے شہر جا رہے ہیں، وہاں قدم قدم پر دقت کی ضرورت ہوگی تمہیں، لوٹے لو۔۔۔۔۔“
نہ جانے سندر کے جی میں کیا آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھٹکنے لگے اور روتے
ہوتے اس نے میرا ناچیز تحفہ قبول کر لیا۔

بھائی نے حیا کی وجہ سے آنچل منہ کے سامنے کھینچ رکھا تھا۔ جب بھی جذبات
اُسے کچھ اجازت دیتے تو وہ سندر کے پاس فیری میں رکھی ہوئی گھڑی کی طرف اشارہ
کر دیتی۔ جس میں اس نے کچھ مٹھیاں یا نمکدہ دی تھیں۔ وہ کہتی تھی: — تمہارے
دو چاروں کے لئے کافی ہوں گی۔ ہاں دیکھنا! انہیں گھی میں بھون رکھا ہے۔ مان کے
کھانے کے بعد پانی نہ پینا۔ کھانسی ہو جائے گی اور اگر پانی کے بغیر نہ بھی۔ وہ کو تو اپنے
کے بعد پھر ان میں سے تھوڑا اور کھا لینا۔ کھل صاف ہو جائے گا۔ تھوڑی روٹی نہ
کھانا۔ پیٹ میں درد ہوگی۔ اس سے تو آپ ہی تکلیف کر لیا اچھا ہے۔ دو دو روز نہ
بستر آتے تو دوسرے تیسرے ہی سہی۔ مگر مینا ضرور۔ کتنے کمزور ہو رہے ہیں۔ تمہارے
جسم سے تو کوئی سیر نہیں ہو سکتا۔ اسے لکاش! تمہارے چلنے اور میں تمہاری خدمت
کرتی بیٹھیں تو نہ ہوتی پھر دل میں کتنی — اس نام کے دل میں شاید میرا شوق
ہے۔۔۔۔۔ اور آنسو پٹ پٹکھی کی آنکھوں سے بہنے لگے۔
باپ نے رقت بھرے گھٹے سے کہا۔

گرہن

”بیٹا! میں تمہیں ارکرتا تھا، بیٹا۔۔۔۔۔ ارے بھول جانا میں بڑھے کے
پاکل پن کو۔۔۔۔۔“

سندر جو اس وقت تک ضبط کئے ہوئے تھا۔ روویا۔ بولا: ”اپو! راستے تو
تھے تم، اور پھر خود ہی سیکنے کے لئے روئی بھی تو تلاش کرتے تھے۔ بھول گئے کیا؟“

———— اور فیری ہمارے مجروح دل کی طرح تھپیرے کھاتی ہوئی دوسرے
کنارے پر چل دی اور ہم سب لوگ طوفانِ باوجودِ باران میں کھڑے صدری چپ دریا
روال ہاتے رہے۔ آخر بارش نے ہوا میں اڑنے والے کپڑوں کو کھجکھجکایا اور نظر کی
کم مائیگی نے ہمارا پیچھے ہٹا دیا۔! —

سندر کے چلے جانے کا اٹھ سب پر بہت مختلف طریقوں سے ہوا۔ مثلاً میرا
منجھلا بھائی سوہنا تمام وان ملگین رہنے لگا۔ اسے کسی میز سے لچھی نہ رہی۔ اسے سندر
سے خاص لگاؤ تھا۔ اوپر تھے کے بھائیوں میں لڑائی بھی بہت ہوتی ہے اور محبت بھی۔
میں بھی عموماً اویں ناظر رہا کرتا تھا اور بات بات پر ماں اور بھابی سے جھگڑا
کرتا۔ میں نہیں جانتا۔ ہمارے جھگڑے میں قصور کیا وہ کس کا ہوتا۔ اگر میں اپنی بے قصوری
بتاؤں، تو یہ یقیناً ایک طرف فیصلہ ہو گا۔ لیکن یہ بات تو ضرور تھی کہ اپنے بیٹے اور خاندان
کی بددلی کی وجہ سے وہ دونوں عورتیں رورود کر چڑچڑی ہو گئی تھیں اور میری بھوٹی
سی ضد کو بھی برداشت نہ کرتی تھیں۔

۔۔۔۔۔ اور جب سندر کے تینوں بچے بلکتے اور ننھا اپنی ماں کی بے درجہ
چھاتی کردائوں سے کاٹ لیتا تو بھابی بڑے زور سے اسے چارپائی کے نیچے پھسکا دے

گوشت

دیتی۔ اور پھر بچے کے شور، اس کی ملامت، باپ کی گالیوں، اور مہاجی کے رونے سے گھر بھر میں کھرم بچ جاتا۔ اس وقت میں خوش ہو کر کہتا۔ اچھا ہوا سندھ چلا گیا۔ اب دو کم سے کم نائب تحصیلدار تو بن ہی جاتے گا اور وہاں دو بھی کسی پری کے ساتھ پیش و عشرت میں مشغول ہو گا۔ کیا محب ہو وہ اس وقت گھنٹہ گھر کے اندر گدناہج رہا ہو۔۔۔۔۔

ننگا۔۔۔۔۔ اس دفعہ گرام میں ہی دسین، آن پڑا۔ شاید صاحب لوگوں کا گرمیوں میں بھی میلہ ہوتا ہے۔ جسے ایشتر کہتے ہیں۔۔۔۔۔ نتھو گوبرانی اپنی جینے بھر کی محنت ایک ہزار جوڑے اپلوں کے پینیک گئی اور ہمارا بھاڑ دودھی آگ سے دن رات پھینکنے لگا۔ ہم دونوں بھائی نہایت محنت سے گتروں کے پھیلے مکھاتے، کوٹتے، اندھے پانی میں ڈھیسٹ، کوٹتے اور پھر دودھ میں جا کر اپنی ازلی سزا بھگتے۔ ایک دن موہنے کی شکل نہایت مہیب ہو گئی۔ گھڑوں سپینہ اور اس کے جذبات کے تاثرات نے اس کی شکل کو بہت خوفناک بنا دیا۔ اس نے اپنی شعلہ فکں لٹکا ہوں کو مجھ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

”رہو۔۔۔۔۔“

میں نے بغیر جواب دیئے اپنا منہ اس کی طرف پھیر لیا۔ وہ بولا۔
”سندھ تو چلا گیا ہے اس بار۔۔۔۔۔ اور میں بھی چپکے سے بھاگ جاؤں گا۔“
اس وقت میں ایک دھندلے کے اسکس سے کانپا۔ آخر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے میں نے کہا۔ ”اتو کہیں کا!“
”سچ کہے دیتا ہوں۔۔۔۔۔ باپ کو نہ کہو! مجھ سے یہاں زندہ نہ رہا جائے گا۔“

گرمی

میں نے نشیمنیں ہوتے ہوئے کہا۔

”تو تمہارا مطلب ہے — میں یہاں اکیلا مرا کروں؟ تنہا ہی بھاڑ جھونکوں؟
واہ رے نواب کے بیٹے! میں آج ہی کہہ دوں گا باپ کو“

سوہنے نے فوراً نونچل اندھن پر پھینک دیا اور جھپٹ کر میری گردن دیوچ
لی اور اس زور سے گلا دبا کہ میری آنکھیں باہر نکل آئیں اور شور بھی میرے گلے میں
گھٹ گیا۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اور سوہنے نے
میری گردن چھوڑ دی لیکن شام کے وقت جب میں نے باپ کو دور سے دیکھا تو میں
بھاگ کر اس کے پاس چلا گیا اور ہچکیاں بلیتے ہوئے سوہنے کی حرکت بیان کی اور
اس کے خوفناک ارادہ سے مطلع کیا۔

باپ نے اسی وقت پانی میں بھگو یا ہوا بیت اٹھایا اور اسے سوہنے کے جسم کے
ساتھ پیوست کر دیا۔ سوہنے نے بیت کی پھڑکی پر لڑائی اور ایک جھٹکے سے باپ کے
ہاتھ سے پھین لی۔ اسے توڑا، مروڑا اور وہ پھینک دیا۔ باپ کے ہاتھ ایک لمحہ کے
لئے لرز اٹھے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ سوہنا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا ہے۔ ”وہ حرامکار . . .
. حرامکار“ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے اور فیرو کے مالک سے مل آئے
اور اسے کہہ دیا کہ اگر سوہنا نہیں کھڑی سے پار جانے کے لئے کہے۔ تو نکار کر دینا۔
سوہنے کو بھی اس واقعہ کا علم ہو گیا۔ اب اس کے پاس سوائے اہل بات کے
چارہ نہ تھا کہ روز بلا ناغہ نمبر سے آئے کو ہوا میں اچھالے اور وہ گول چکر کاٹتا ہوا
اس کے ہاتھوں میں آگے۔

ایک دن میں بھاڑ کے قریب سے اٹھ کر اسپین سے شراورد ہو میں چلا گیا۔

گرم

اور مجھے بخار ہو گیا۔ اس کے بعد پھیپھڑوں کو ہوا لگ گئی لیکن زندگی کے سانس باقی تھے۔
دار و درمن سے پنج رہا۔ ان دنوں سوہنا بیکری میں اکیلا کام کرتا تھا کبھی کبھی باپو ہاتھ بنا
دیتے تھے۔ لیکن اب باپو بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کا کام کرنا نہ کرنے کے برابر ہوتا تھا۔
ان دنوں سوہنا جب بھی میرے پاس تیمار داری کی غرض سے آتا۔ تو کہتا۔
”یہ دنیا دکھوں سے بھری پڑی ہے۔۔۔۔۔ اس سے ترسنا کارا ہو جاتے
تو اچھا ہے۔“

میں خاموشی سے کہتا۔

”ہاں سوہن۔۔۔۔۔ اور دیکھتے ہو سانس بھی تو نہیں لیا جاتا۔ اس سے بڑا
اور دکھ کیا ہوگا۔ اس سے تو یہی اچھا ہے۔ کہ میں۔۔۔۔۔؟“
سوہنے نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

”نہیں بھائی۔۔۔۔۔ اچھے ہو جاؤ گے تم۔“
”شاید پندرہ میں دن اور تمہیں اکیلے کام کرنا پڑے! بڑی مصیبت ہے۔“
”کہ تو تو نہیں تم اچھے ہو جاؤ۔۔۔۔۔“

ابھی میں اچھی طرح سمجھلا بھی نہیں تھا۔ کہ مجھے دو چرواہے اپنے گھر کی طرف بھاگتے
ہوئے دکھائی دیے۔ اس کے بعد گھر بھر میں افراتفری پھیل گئی اور دھوک عبدالاحد
کی دو گوجرانیاں آگئیں اور پولیس جو ہال میں بڑے نیچے سوہنا ماراڑا ہے۔
میں اپنے آپ میں کچھ سکوت پاتے ہوئے چوہال کی طرف دوڑا۔ وہاں قبضہ کے
بہت سے لوگ جمع تھے۔ انہوں نے میرے لئے خود بخود راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے
دیکھا۔ سوہنے کو دونوں آنکھیں باہر کھیر آئی تھیں اور زبان دھیل ہو کر منہ کے ایک

گرم

طرف باہر نکل آئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک رستہ پڑا تھا جسے وہ دودھ دھوتے وقت اپنی گائے کی پھیلی ٹانگوں میں باندھا کرتا تھا۔ تو سوہنے نے غور کشی کر لی اور تمام آگ اور خمیر سے آٹے سے تجات مہل کر لی۔ اب وہ تمام دکھوں تکلیفوں سے چھٹکارا پا کر اس چوپال میں جہاں وہ بیٹھ کر اپنا حقہ منگاتا تھا۔ اپنی گولیوں کے بھجورنے پر پڑا تھا۔ اسی جگہ جہاں وہ سندھ کے ساتھ بیٹھ کر ناممکن الوجود شکھ کی زندگی کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔

میں نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے باپ کے شانے کو زور سے پکڑ لیا اور کہا۔

”باپو“

باپو نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا ”باپو، اسے جلا ناست...“

ڈھوک کا انچارج بولا ”تو سسکار کیسے ہو گا؟“

میں نے باپو سے کہا ”آگ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہی تو سوہنے

نے یہ کیا ہے، باپو، کیا تم پھر اسے آگ میں پھینک دو گے؟“

سندھ کو کئی خط واپسی کے لئے ڈالے گئے۔ لیکن اس نے ایک بھی خط کا

جواب نہ دیا۔ میں نے سوچا۔ وہ کہیں اپنی ہی رنگ رلیوں میں مصروف ہو گا۔ ایک دو سال بعد سوہنے کی موت کا غم کچھ ہلکا ہوا تو باپو کی باری آئی اور ایک دن وہ موہنے کے لئے گئے۔ تو پھر نہ آئے۔

اس کے بعد بیکری کا کام میرے ذمے پڑ گیا جب میں بہت مایوس ہوا تو پھر

سندھ کو ایک چٹھی لکھ ڈالی اور حسب معمول کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے سوچا ہندو اس بار

عیش و عشرت میں مشغول یہاں کیوں آنے لگے گا۔ اچھا ہوا جو وہ اُدھر چلا گیا۔ اور جب میں نے زیادہ گہری نظر سے جانچا۔ تو میرے دل نے کہا سوہنے نے بھی اچھا ہی کیا۔ جو سب دکھوں تکلیفوں سے نہات ماس کر لی۔

_____ اور آخر ایک دن ہمیں ایک بوڑھا اپنی دکان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے منہ پر سینکڑوں بھریاں تھیں۔ میں نے نہیں لیکن میرے نوٹوں پہچان لیا کہ وہ سندر ہے۔ میں دوڑ کر اپنے بھائی سے لپٹ گیا۔ ہم سب بہت دیر تک روتے رہے۔ حتیٰ کہ مجھے اس کی میت کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخر ان تاثرات کی بنا پر جو کہ میرے ذہن میں اچھی طرح منقش تھے۔ میں نے سند کو بناتے ہوئے کہا: ”واہ رے! میرے نائب تحصیلدار!“

سندر مسکرا دیا۔

میں نے پھر تنگ کرنے کی غرض سے پوچھا: ”اور وہ تمہاری میم کہاں ہے؟ یہ پونلی اسی نے دی ہوگی تمہیں؟“

اس وقت سندر کو ہلکی سی کھانسی آئی اور اس نے غور کے قریب ہی تنوک دیا۔ مجھے اس کے تنوک میں ایک سرخ دھبہ سا دکھائی دیا۔

میں دم بخود کھڑا سوچنے لگا۔ کیا دوسرے کنارے پر یہی کچھ ہے یہی بھریاں؟ یہی مری می بلکی کھانسی جس میں خون کا دھبہ ہو اور وہ ہونا کس امید پر مر گیا، کیوں؟ کس لئے؟ کس کنارے کی تلاش میں؟

اور ایک دن کھڑی کے کنارے کھڑے ہو کر میں نے سندر سے کہا۔

”سندر تم نے دیکھا ہے، اوپانی کی لکیر کتنی آب و تاب سے چمکتی ہے۔“

گرم

منہ رکھانے لگا۔ وہ ایک جگہ دم لینے کے لئے ٹھہر گیا اور بولا: "بس پانی کا
 عبور کر بھی خیال نہ کرنا رہو! وہ جو تمہیں چمکتا ہوا پانی دکھائی دیتا ہے وہ ریت کے
 پختے بونے لاکھوں ذرے ہیں اور اگر یہ نیلی نیلی خوب صورت کھاڑی سوکھ بھی جائے
 تو وہ پانی نہیں سوکھے گا اور ابدال آباد تک چمکتا چلا جائے گا!"

آلو

لکھی سنگھ رائے کلوٹال کے قریب بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس وقت نہ تو اسے ہندستان کی اقتصادی بد حالی کا خیال تھا اور نہ خاکروہوں کی برائیاں کے متعلق تشویش تھی۔ آج شام کو گھر پہنچنے کے لئے کیا سہ ماہی بس اسی بات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ گھر میں صحن کا تین چوتھا حصہ چھوڑ کر باقی میں بس تو نے پام اور پارا کر اس کے علاوہ پودینہ اور بیگن کے پودے لگا رکھے تھے۔ لیکن ابھی تو بیگن کے پودوں نے نیلے نیلے اودے اودے پھولی ہی نکالے تھے۔ ابھی تو ان میں پگمنٹس (PIGMENTS) کی نشوونما بھی اچھی طرح سے نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں بیگنوں کا خیال کرنا تو محض ایک احمقانہ بات تھی۔

لکھی سنگھ شروع سے پودوں کی کاشت کے خلاف تھا حالانکہ بس تو گھر میں

ہر اول کو بہت پسند کرتی تھی۔ بڑی آنکھوں کو طراوت دیتی ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے۔
لیکن لکھی سنگھ نہایت بے صبر انسان تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آج ہی بیچ بودیا جائے
اور آج ہی میل لگ جائیں۔ ہندوستان کی آزادی کے متعلق بھی اس کا کچھ ایسا ہی
خیال تھا۔ پردوں کو روزمرہ پانی دینا، ان کی نگہداشت اور پھر انہیں نہایت سست
رفتار سے بڑھتے دیکھنا اس کی تاب نہ دے رہا تھا۔ اسی لئے تو اس نے سبتو
کو صاف کہہ دیا تھا کہ پودے لگانے کے بعد میں واپس آ جاؤں گا۔ وہاں دو چار
ماہ رہوں گا۔ تاکہ میری دلچسپی پرائیگس میل رہے ہوں اور یہی محسوس ہو۔ جیسے میں نے
کل ہی انہیں بویا ہے اور آج میل بھی لے لئے ہیں۔

لکھی سنگھ نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ سب کا سر نیچا چکے تھے۔ لیکن
اس کے کانوں میں ان کی پر شور بحث کی گونج باقی تھی۔ پھر اسے خیال آیا۔ خاکروہوں کی
بڑائی کس قدر کم ہوئی ہے۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں، گنجان آبادی، گز رہ گاہوں
اور سڑکوں پر جا بجا کڑے کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔ شاہ عالمی کے باہر ٹھوڑوں کے
موضع کے قریب میٹے کا پاڑا پڑا ہے۔ ٹھنڈی سڑک کی طرف جانے والی سڑک پر تین
دن سے ایک بیل مرا پڑا ہے جس کی لاش سے سڑا ہوا اندازہ ہسپتال کے مریضوں تک
پہنچ رہی ہے۔ اس کے اپنے کوچ بولا میں جہاں شہر کے سروسے جانے والے اچالچ
رہتے ہیں اتنا تعفن پیدا ہو رہا ہے کہ اچالچ باہر نہیں نکلتے۔ اور ہندو کا مروتہ بغیر اچالچ
کے کیسے جلا یا جاسکتا ہے؟ یقیناً بہت سے مروتے گلیوں میں پڑے بدبو پھیلانا
رہے ہوں گے۔ ٹھنڈی سڑک کے قریب سے ہونے کی طرح۔

کھڑکی میں سے ایک تیز بدبو آنے سے لکھی سنگھ اٹھا اور اس نے تمام دروازے

بند کر لئے۔ وائیں طرف گھومنے سے اس کی نگاہیں مائیکلو سٹائل کے اور ایک کھونٹی پر جا پڑیں۔ اس کھونٹی پر کامریڈ بخشی کی میٹنگی رہ گئی تھی۔ جس کے ایک طرف سٹرغ پروں کا ایک خوبصورت پلوم لگا ہوا تھا۔ آخر بخشی نے سرکاری ملازمت کر لی تھی۔ اس لئے مسک کارمیڈیل کہ بد فتنہ کی نظم وہ چند چاندی کی ٹپلوں کے عوض میں چھوڑ گیا۔ ”گاتے رہے تھے بخشی رجعت پسند ہو گیا تھا۔ سب نے کہ مرید سے محبت کی تھی۔ اور رامبرہی کے لئے اسی کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے گیت گاتے تھے اس کے افانوں کی تعریف کی تھی اور اب ؟ لیکن سو روپیہ ماہ لینے پر بھی اس کا چہرہ اس قدر اترا ہوا تھا وہ بار بار گھر اگر اپنی پتلون کی کریر ٹھیک کرتا تھا اور بے تماشا انھیں جھپکتا تھا شروع بحث میں فوت ہاتا تھا پائی تک پہنچ گئی تھی اور اسے پیرتا بھی گیا تھا۔ اس کی قمیص کا ایک حصہ تیز ابھی تک ایک کرسمی کے اجرے ہوئے کیل میں اڑا ہوا تھا۔ اس نے میٹ کی مجبوروں کو تذکرہ کر کے ہر ایک کے جذبہ رحم کو اکسلنے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں سب کی آنکھوں میں نفرت تھی معلوم ہوتا ہے اتنے بڑے نصب العین سے گر جانے کا اسے خود بھی احساس تھا۔ لیکن وہ ایک حد تک مجبور تھا۔ اس کی تین بہنیں تھیں۔ شادی کے قابل : ایک بوڑھا باپ — ڈاکٹر جو کہ کسی ریاست سے ریٹائر ہوا تھا۔ اور جس کی حیثائی زیادہ اعتبار ملے وجہ سے کم ہو گئی تھی۔ ماں کے علاوہ چار بھائی تھے جن میں سے دو مقامی ہائی سکول میں اور سب سے بڑا شہر سے باہر ایک کالج میں تعلیم پاتا تھا اور ان سب کے پیٹ اینڈ من مانگتے تھے بخشی نے ہر ایک کے اعتراض کا فرواؤ فرما جواب دینے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی اور پیٹھ جانے کے فوراً بعد ہی وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور اس سرسبز

گرمی

جلتے اور مکھی سنگھ آہستہ آہستہ ٹیک پر سے اترتا اور پری محل سے نکل کر سرکھ روڈ کی طرف چل دیا۔ بازار میں کتے دہی بڑے کے خالی پتے چاٹ رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کا دودھ سے بھرا ہوا آب خور: بازار میں گڑ گڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور سرمئی سیاہ سڑک پر بکھرا ہوا دودھ اتنا بھانک دکھاتی دیتا تھا جیسے قحط کے دنوں میں گورنر کے غلام دشو کا کوئی بڑا سا کرائی سیف تقسیم سر بازار رکھ دیا جاتے۔ لڑکی سوکس باختہ ہو کر آب خور سے لڑکے کے ٹکڑے اکٹھے کرنے لگی۔ گویا انہی ٹکڑوں کو سمیٹ کر گھر لے جاتے گی۔

آسمان پر کائنات کے دھوئیں کی ایک لمبی سی لکیر سمیر لین روڈ تک جلی آتی تھی۔ اگرچہ گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا تاہم فضا میں خشکی باقی تھی اور دھوئیں کے ٹکڑے آسمان کی سپیدی مائل نیلا ہٹ کے غلاف دھبوں کی صورت میں چاروں طرف بکھیرے ہوئے تھے۔ اچانک ایک تیزری بدبو نے مکھی سنگھ کو ناک پر دمال رکھنے کے لئے مجبور کر دیا اور وہ موچنے لگا۔ کمیٹی کی طرف سے اس میٹل کے نکاس کا خاطر خواہ بندوبست نہیں۔ لوگوں کے گھر غلاظت سے بھرے پڑے ہیں لیکن پھر بھی لوگ برابر ایک پیٹ کی مزدورت سے زیادہ کھاتے باتے ہیں۔

اب تک مکھی سنگھ سبزی منڈی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ منڈی کے ڈواڑے سے کچھ چھپڑے چسپیں ہیں دیں کرتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے بل گروں کے قریب سے زخمی تھے۔ اس کے باوجود نہ توجہ کو پرے کھسکا یا گیا تھا اور نہ ہی ٹکڑی کے سخت لٹھے اور اس پر زیا کس کے لگائے ہوئے چیل کے کیلوں کے گرد کوئی جھینڑا بیٹھا گیا تھا۔ گاڑی بان سیلوں سے گزر کر ان کے مالکوں اور رکھنے والوں کو

گرم

گاہیاں دسے رہے تھے۔ گوالمٹی چوک کو اکالیوں کے ایک بے چوڑے جلوس نے روک رکھا تھا۔ یہ لوگ سرگودھا میں مورچہ لگانے کی بابت مورچ رہے تھے لکھی سنگھ نے اتفاق سے اپنا ہاتھ ایک چھکڑے کے پیچھے رکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک آلو آگیا۔۔۔۔۔ یہ وہی چھکڑے تھے جو کہ ہر روز صبح ساڈھ ٹیس الدین کی طرف سے آلودن کی پوزیٹال لے کر سبزی منڈی کر آتے اور اپنی دہشت میں تمام آلو انڈیل کر اپنے گھر لوٹ جاتے۔ پھر بھی دھڑے کے قریب یا کسی گانٹھا اور اونچے بیچ میں کوئی نہ کوئی آلو ٹکرا رہا جاتا۔ لکھی سنگھ نے تمام چھکڑوں کے پیچھے سے ٹٹول ٹٹول کر میر بھر کے قریب آلو اکٹھے کر کے اور اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ آنسو نہ تو غم کے تھے اور نہ مسرت کے بلکہ یوں غلامی میں ایک ہڈی شکریہ و امتنان کا اظہار۔ یا وہ آنسو ایسے تھے جو غامی حیرت کے آٹا ٹاٹا بھر جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

لکھی سنگھ نے گھر پہنچ کر تمام آلو بستیو کے سامنے بکھیر دیئے۔ آج بستیو شام ہی سے لکھی سنگھ کی راہ تک رہی تھی۔ آج اس وسیع راز عورت کر بھی کاسریڈ کے آنے سے پہلے پہلے کوئی چیز پلانے کی ترکیب نہیں سوچی تھی۔ اچانک اندر سے لکھی سنگھ کا بڑا لڑکا کر نیل نمودار ہوا اور رموی میں بکھرنے ہوئے آلودن کو ہوا میں اچھالنے لگا۔ لکھی سنگھ نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی اور آلو میٹ کر ایک کونے میں ڈال دیئے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی لکائی یونہی ربار کی جلتے اور کر نیل رو جائیں۔ کیونکہ اسی باتیں تو ہر روز ہوتی تھیں۔ گھر میں حصے کو کچھ تیسرہ آتا تھا اور اس کے بعد جب وہ کسی چیز کی طرف حوسہ باندھتا تھا۔ سے کہتا تھا یا باب کی طرف سے ایک چپت رسید ہو جاتی۔ اگرچہ کل کی چپت سے اس روز کی چپت زیادہ سخت تھی تاہم

اس سے کرنل کو ایک اور شرارت کا موقع آسانی سے میسر ہو گیا۔ اس نے شیشے کے سانے سے باہم اعطائی اور نصف سے زیادہ اپنے ماتھے پر مل لی۔ کرنل کو باہم ملنے کا بہت شوق تھا۔ اسے وہ پیشانی پر ٹھنڈی لگا کوئی تھی۔ وہ باہم کھسی سنگھ نے بسنتو کے لئے خود میری تھی کیونکہ وہ لیکور یا کی مرینہ تھی اور اسے ہمیشہ سرد در دہتا تھا۔ کھسی سنگھ نے باہم کو شائع ہوتے دیکھ کر دوسری محال پر بھی ملنا چھارنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سوچنے لگا کہ باہم تو پہلے ہی نصف سے زیادہ ختم ہو چکی ہے۔

اس وقت کھسی سنگھ کو سبرک لگ رہی تھی اور وہ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا۔ اس نے بات بال بچوں کی تربیت سے شروع کی اور کہنے لگا۔ بچے تو انگریز عورتوں کو پالنے آتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کو ماں بننے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ بسنتو اس طور پر انگریزوں کی تعریف نہیں سن سکتی تھی اور عموماً بات یہاں ختم ہوتی — ان لوگوں کے پاس بچوں کو کھلانے کے لئے آیا ہوتا ہے۔ روٹیاں پکانے کے لئے خاناسے اور کھسی سنگھ ایسی باتیں سن کر چپ ہو جایا کرتا تھا۔ شلٹوں کے حلقہ میں دو گھنٹوں بحث کر سکتا تھا۔ لیکن اس جگہ وہ پانچ منٹ سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ حقیقت اتنی تلخ ہوتی تھی۔ کہ اسے اپنے چہرے کا عکس دکھائی دینے لگتا۔ لیکن آج اس بات پر بھی بسنتو خاموش رہی۔ اچانک دروازے کی طرف سے سخت سڑانہ آئی اور کھسی سنگھ گرج کر بولا۔

”تم سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ دروازہ بند کر لیتیں بس تو اسے ڈاؤمی ہی جینا چاہی ہو تم۔“

بسنتو نے اٹھ کر چپکے سے دروازہ بند کر دیا۔

کھسی سنگھ اپنی ڈاؤمی کے کچرے ہوئے بالوں کو سوئی لگا کر صحن میں ٹپٹنے لگا۔ بھوک

کی وجہ سے اسے ڈکارا رہے تھے اور پیٹ میں ناف سے اوپر ایک عجیب طرح کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ جیسے سیلاب میں دریا کے کنارے ایک پرشور آواز کے ساتھ پانی میں گرتے ہیں۔ اسے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پیٹ کی دیواروں سے کوئی چیز اندر محد سے میں گر رہی ہے۔ یکایک لکھی سنگھ کو کچھ سوچو گیا۔ پودوں کو اپنے سامنے پا کر بولا۔

”بھلا ان بیٹن کے پودوں کا فائدہ ہی کیا؟“

”فائدہ کیوں نہیں؟“ بسنتو نے آؤں کو دیکھی میں ڈالتے اور ہاتھ چھانٹتے ہوئے کہا۔ لیکن لکھی سنگھ اپنے مخصوص دوا بیہ انداز سے گرجا میرا تو جی چاہتا ہے کہ انہیں، ابھی، اسی وقت اکھاڑ کر ٹینک دوں۔ ددھینے سے اُد پر ہونے کو آگے ہیں اور ان میں پھل کا نام و نشان تک نہیں۔“

لکھی سنگھ اور بسنتو میں اس بات پر بہت جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ کہ مٹی ہوئی بسنتو بول۔

”تبھی تو تمہیں بچوں سے نفرت ہے۔“

”بچوں سے مجھے کاتبہ کو نفرت ہوئی؟“

”اٹھارہ سال کی عمر تک ان کی خدمت کا تم میں صبر کہاں ہے ابھی بے کہ ہے ہو کہ لکھی کو گانا سکھانا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ بچپن ہی میں کہانے لگے اور اسی عمر سے ہم اس کی کہانی کہانے لگیں۔“

لکھی سنگھ خاموش رہا اور مونگی توری کی پیل کے گرے ہوئے سے کو کیل پر مانگنے لگا۔ بسنتو ماں تھی۔ اس میں بچے اور پودے پالنے اور انہیں بہتہ بہتہ

بڑھتے دیکھنے کا سوا عملہ تھا۔ وہ ہر روز صبح اٹھتی اور کہتی — آج بیگنوں کو رو
بھول گئے ہیں اور دو کی ٹنڈیاں بھول رہی ہیں اور مونگی توڑی پر بھی شہد کی کھیاں مٹھتی
میں۔ اب تو ریاں بھلنے کا موسم آیا ہے نا اور تم نے آخر کرنیل سنگھ سے کس جھگ کا
بدلہ لینا ہے؟ آخر ہولے ہولے سمجھ وار ہو جائے گا۔ یونہی اسے پیٹتے رہتے ہو۔ لکھی
سنگھ کو خیال آیا۔ کہ مونگی توڑی کی بیل کر وہاں سے کاٹا گیا تھا۔ وہاں سے زیادہ سرسبز
ہے۔ وہاں زیادہ کوئلیں بھونپی ہیں۔ وہ فوراً بول اٹھا جیہ پودے کاٹنے پھانٹنے سے
زیادہ نشوونما پاتے ہیں۔ تبھی تو میں کوئیل کو مارتا ہوں ۛ

جس دن لکھی سنگھ اور بنتو کا جھگڑا ہوا۔ اس دن بنتو وہی ڈھیللا ڈھال لالہ بی بلاؤ
پہنتی جس سے لکھی سنگھ کو سخت نفرت تھی۔ اور وہ دوپہر تک سر کے بالوں کو سیدھا
نہ کرتی۔ اپنے کپڑوں اور اپنی شکل سے وہ یوں سست اور زرد و کھائی دیتی۔ جیسے وہ
حالیفہ ہے۔ لکھی کبھی رہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ کہتی اور لکھی سنگھ آہستہ
آہستہ کہتا ہے ہمت بھرا نا تھا۔ زور سے رونے کا اس پر کبھی اثر نہیں ہوا تھا۔
اس کا خیال تھا کہ یہ ہلکی چیزیں مثلاً ہلکی کھانسی اہلکا ہلکا بخار اہلکا ہلکا ہنٹ ہمیشہ
خطرناک ہوتا ہے۔ اس وقت بنتو اسے مزید تنگ کرنے کے لئے کھاٹ پراوندھی پر جاتی
اور پاتمی میں پاؤں اڑا کر یونہی زور لگاتے لگتی اور پھر سفری پتھر سے میں نصف دھوپ
اور نصف چھاؤں میں ایک ہولناک آواز سے کوہتا رہتا اور پھر یک دم سیخ اٹھتا۔
جیسے اسے چوٹیوں کے کسی دستہ نے یک لخت کاٹ کھایا ہو۔

ہنڈیا میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ آوازیں چکے تھے۔ بنتو نے نہیں
سرہ پانی میں اٹھایا اور لکھی سنگھ انہیں چھیل کر کھانے لگا۔ ان آدمیوں کے موٹھ میں

کچھ بھی نہیں تھا اور لکھی سنگھ یہ معمول جانا چاہتا تھا کہ ان سیر آلوں میں بسنتو، کرنیل، مکھیر اور بچے کا حصہ ہے۔ وہ کوتاہ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ آلو پیٹ کو غلیظ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نمک مریخ لگا کر انہیں چٹخار سے لیتا ہوا کھالیا گیا تو یہ کہہ رہا ہوں مجھے اپنے پیٹ کی غلاظت بہت پسند ہے۔

زندگی خوشگوار تھی۔ اس میں آسائش نہ تھی۔ سوہن سلوہ نہ تھا۔ لیکن آلو تو تھے اور لکھی سنگھ ہر روز شام کو مکھیر لین روڈ پر سے ہوتا ہوا سبزی منڈی کے قریب ساکھڑا ہوتا اور عائدہ شمس الدین کو لوٹنے والے بھڑوں پر سے تمام آلو پیٹ لیا کرتا۔ اٹھارہ تاریخ کو اسے ہندوستان ٹائمز سے "گڈ آرڈر" کے مسائل کے مضمون کے پیسوں کی توقع تھی اور آج بارہ تاریخ تھی پیٹ کی آگ کے لئے آلو کافی تھے۔

اچانک کمیٹی کی طرف سے بیل گاڑیوں کے لئے نیوٹنک ٹائروں کا بل پاس ہو گیا۔ یہ سب کچھ غریب گاڑی بانوں کی ہمتا سے باہر تھا۔ وہ سو سو روپے کے ٹائر کیسے دیا کر سکتے تھے؟ کاسٹیرز کے ایک اجلاس نے گاڑی بانوں کی ہڑتال کروانے کا فیصلہ کر لیا اور لکھی سنگھ نے بھی ہڑتال کو کامیاب دیکھنے میں سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ہڑتال کے پہلے ہی روز زندگی آلوؤں سے خالی ہو گئی تھی یکسر خالی۔ ڈیوشن کی تلاش میں سارا دن گھر سے باہر گھومتے رہنے کے بعد لکھی سنگھ بسنتو کی وسیلہ سازی پر یقین کرتا ہوا ایک مجرم کی طرح گھر کے اندر داخل ہوا لیکن بسنتو روزمرہ کی طرح آلو تیل کا انتظار کر رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی لکھی سنگھ غور سے مٹیگن کے پودوں کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن ابھی تک تو پودوں کے کلور دھل نے بھی اسی طرح سے نشوونما نہیں پائی تھی۔ لکھی سنگھ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا تاکہ وہ آلوؤں کے متعلق پوچھے ہی نہیں اور

گدھن

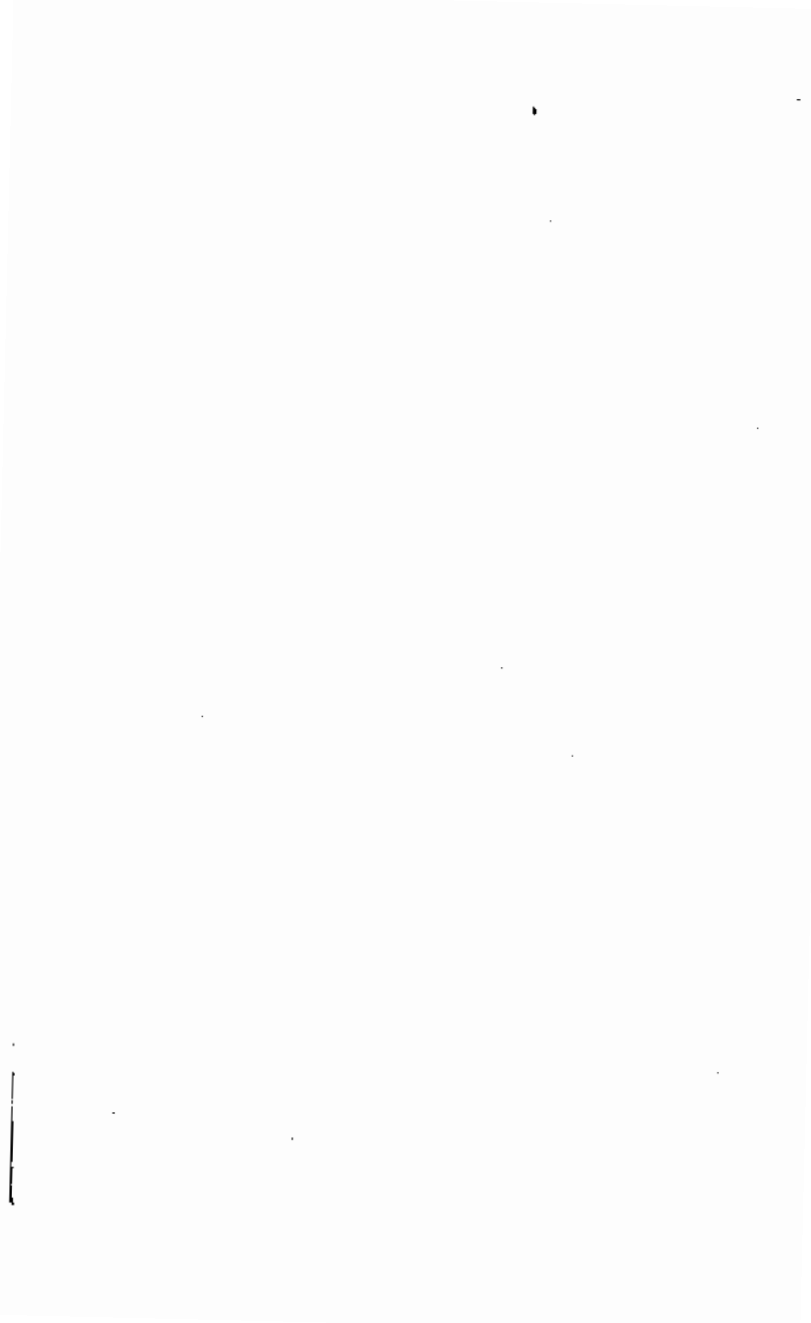
رہنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے لڑ کر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ پر پڑ رہے ہیں۔
لکھی سنگھ چاہتا تھا کہ اس لڑائی کے بعد ہمیشہ کی طرح بستو اپنے میکے چلے جانے کی دھمکی
دے اور وہ فوراً رضا خدیو کو رکھے سٹیشن پر بلا ٹکٹ گاڑی میں سوار کروادے۔ لیکن آج
بستو نے وہ گلابی بلاؤز نہیں پہنا ہوا تھا۔ آج اس نے ویل کی سفید صوفی باندھ رکھی
تھی جس سے لکھی سنگھ کو عشق تھا۔

اس وقت لکھی سنگھ نے بستو کو گاڑی باتوں کی ہڑتال کے متعلق بتایا اور انہوں نے ڈالنے
کی وجہ جان کی بستو کچھ دیر اپنا سر ہاتھ میں دینے بیٹھی رہی۔ پھر وہ شمشلیں انداز سے لکھی سنگھ
کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم نے ہڑتال کی مخالفت کیوں نہ کی؟"

لکھی سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بستو ہڑتال کے محرکوں کو گالیاں دینے لگی ان محرکوں
کو جن میں اس کا اپنا لکھی سنگھ بھی شامل تھا اور جن میں سے بخشی محض اس لئے نکل چکا تھا کہ وہ
آؤں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لکھی سنگھ سوچنے لگا۔ بستو نے ایک اچھے کاسٹریڈ کی
طرح ہمیشہ سیراسا تذوینا تھا۔ لیکن اب وہ بھی مجھے بواب سے رہی ہے۔ اس وقت کریٹل
ٹھکی میں سے آیا اور باب کو خال ہاتھ دیکھ کر رونے لگا۔ بستو جمع سے اسے باپ کی آمد
کا انتظار کرنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اپنے بیٹے کو یوں رونا دیکھ کر بستو اور بھی زہرناک
ہو گئی۔

لکھی سنگھ کو بستو سے یہ امید نہ تھی۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دسے کر بیٹھ
گیا اور سوچنے لگا۔

”کیا بستو رجعت پسند ہو گئی ہے؟“



معاون اور میں

MEHRAN LIBRARY
B-61 Bhangore Tower
Azizabad Karachi
TIME 6 to 10 pm

وہ گنتی میں پانچ تھے، پورے پانچ، زرد رو اور پڑمروہ سے چھوکرے
یوں دکھائی دیتا تھا جیسے جان بخش ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے اور روشنی کی ایک کرن کے
لئے ترس گئے ہوں۔ ان کی آنکھیں دور تک اندر دھنس گئی تھیں اور روشنی کے انحراف
پر کھڑے ہونے کی وجہ سے صرف چند تاریک سے گرٹے دکھائی دیتے تھے۔ اس سے
پہلے وہ جہاں کہیں بھی تھے۔ ان کے بشرے کسے دیکھتے تھے کہ لا انتہا کام اور مسکرنے
ان کی صحت کو غارت کر دیا تھا۔

باتیں طرف سے چوتھے، اپنی کے قریب کھڑے ہونے لڑکے کے چہرے پر کی
آڑی ترجمی لکیروں میں مجھے خود اعتمادی کے آثار دکھائی دیئے اور جہاں باتوں کی نظریں
آتا، اگلی جھبست نکا ہوں سے جھپستی ہوئی دفتر میں ٹکی ہوئی پرانی کنزے یا ریڈ کراس کے

پوسٹر پر جم رہی تھیں۔ وہاں وہ اپنا لاغر سا چہرہ اٹھا کر ایک پر تکین لگاؤ سے میری طرف دیکھتے رہنے کی عبادت کر رہا تھا۔ میں نے ایک چھپنے والی جگہ سے اس کے ٹیالے سیاہ رنگ کی اچکن پر لگے ہوئے پیتل کے رنگ آلودہ بٹنوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”آپ کا کیا نام ہے؟“

”تمبر لال“

”تعلیم؟“

”میریٹک پاس ہوں۔ ٹائپ جانتا ہوں۔ سائٹ کی سپیڈ ہے۔“

———— اس کی تعلیم اور اسپیڈ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے پھر ایک نظر سے تمبر لال کے پورے فستد کو مایا اور قدرے عجیبی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
 ”میرے خیال میں آپ نے پہلے بھی کہیں کام کیا ہو گا؟“

”اس سے پہلے میں تھوڑی سی سودی اور پھر بلاک بنانے کا کام کرتا رہا ہوں بلاک بناتے وقت جست پر شور سے کا تیزاب لگایا جاتا ہے۔ تیزاب کے دھوئیں نے میرے پھیپھڑوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ میں نے وہ کام چھوڑ دیا۔ ایک دو جگہ اور ملازمت کی اور پھر چھوڑ دی۔“

میں حیرانی سے ان پانچوں کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے کوئی بھی رماؤ کی دست برد سے نہیں بچا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا تیزاب کے دھوئیں نے نہ صرف اس کا بایاں پھیپھڑا پھلانی کر دیا تھا۔ بلکہ دنیا کی خوفناک ترین بیماریاں لگادی تھیں۔ اس بیماری کا خفا صحت تھی۔ اس نے تمبر لال نے حقیقت کو چھپائے رکھا۔ بہت کچھ استفسار لکے بعد مجھے صرف یہ پتہ چلا۔ کہ میرے مقابل کھڑا ہوا لڑکا

ایک خود دار انسان ہے۔ کسی کی ناجائز بات کو نہیں مانتا۔ اس لئے وہ قین جگہ جہاں بھی اس نے کام کیا۔ اپنی خود داری کو ٹھیس لگنے سے چھوڑ دیا۔ اب وہ عرصہ سے بیمار تھا۔ یسوع کے وہ الفاظ ”تو نصف مت بن کر تیرا بھی انصاف کیا جائے گا“ میرے کانوں میں گونج رہے تھے جبکہ میں نے پر شکوہ الفاظ میں تمہیں لال کو کہا ”آپ کی اسکن کے رنگ آؤ دین آپ کی صفائی پسند طبیعت کے داؤد خواہ میں معاف کیجئے مجھے آپ کی ضرورت نہیں“۔ اس کے بعد مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے پانچوں کو رخصت کر دیا۔

وہ زینہ سے اترتے جاتے تھے اور ایک پر حسرت نگاہ سے میری طرف دیکھتے جاتے تھے۔ تمہیں لال نے اپنا وہ چہرہ جو میرے اظہار خیال کے بعد بہت ہی زرد ہو گیا تھا اٹھاتے ہوئے ایک جگر سوز نگاہ سے میری طرف دیکھا۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ شاید ایسی درد انگیز ٹیس سیوں ہی اٹھیں اگر میں زندانیاں طور پر اپنی ضرورت کا اعلان کرتا۔ اشتہار چھپو اگر اخباروں میں یا شہر کی مختلف گزرگاہوں پر لگاتا۔ میں نے تو قصداً خفی قلم سے لکھ کر اپنے دفتر کے دروازہ پر چسپاں کر دیا تھا کہ ضرورت ہے ایک محنتی اور قابل لوگ کی جو پندرہ روزہ رسالہ ”کہانی“ میں کام کرے۔ تنخواہ بلحاظ تجربہ دلیاقت۔

معلوم میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے تمہیں لال کو دس بلالیا اور تیرہ روپے ماہانہ پراسے ”کہانی“ میں بطور معاون کے لے لیا۔ چند دن کے تجربہ کے بعد میں نے دیکھا کہ تمہیں لال ان ملازموں میں سے تھا۔ جنہیں قدرت نے جینی طور پر آزاد بنایا ہو۔ لیکن زمانہ کے زیر و زبر نے انہیں ”عبد“ بنا دیا تھا۔ اخلاق جلالی کے مہر صنف

گرمی

نے ایسے ملازموں سے اپنے بچوں کا سلوک روار کھنے، اور انہیں وہی پوشاک پہنانے کی جو کہ خود پہنی جائے، یقین کی ہے۔ مگر میں اس وقت ان آقاؤں سے مختلف نظریہ رکھتا تھا۔ حسب ہدایت مذکور مصنف مجھے تمہیر لال سے ایسا سلوک کرنا چاہئے تھا۔ کہ وہ والدہانہ خدمت کرتا۔ مگر میں نے ایسا نہ کیا بلکہ کبھی تمہیر لال کو یہ ذہن نشین نہ ہونے دیا کہ وہ ایک نہایت قابل معاون ہے۔

میں لام کے دوران میں اکثر یہ کہہ دیا کرتا کہ ایک معاون رکھ کر میں نے اپنے رسالے پر جو کہ عمر کی اولیں منازل طے کر رہا ہے ایک ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا ہے۔

جس روز بھی میں تمہیر بابو سے ایسی باتیں کرتا۔ یا یوں قدر سے درشت کلامی سے پیش آتا تو اس کا لازمی اثر یہ پڑا کہ میرا معاون ایک نہ ٹٹنے والی خاموشی اختیار کر لیتا۔ قلم کا ایک سہرا منہ میں رکھ کر غیر حاضر دل سے کسی طرف ٹٹلکی باندھ کر دیکھتا اور سوچتا رہتا۔ جہاں کس سے پہلے وہ لطیف باتیں اور حسرت فقرے کہتے ہوئے خشک اور بے مزہ کلام میں روح پھونک دیتا۔ وہاں وہ گھنٹوں خاموش رہتا صرف بلاسنے سے بولتا اور اپنی خاموشی میں کبھی کبھار ایک گہری سانس لیتا۔

اس دن دفتر کی حالت بہت ابتر ہوتی۔ فائیمیں الماری یا میز پر بونڈھی سیڑھی بڑی ہوتی۔ شمالی دروازے سے جب ہوا کا اندھا جھونکا آتا تو کسی کھل ہوئی نائل میں سے چند اوراق اسید میں آیا یا داشت کے کاغذ اور کفرش پر منتشر ہو جاتے۔ خریداروں کے خطوط کچھ قلم دان کے نیچے، کچھ میز کی دواڑوں اور کچھ آہٹاری چروں میں مل جاتے۔ مسودات بڑی بے ترتیبی سے رکھے ہوتے قلم وغیرہ سے لاپتہ ہوتے

تیمبر باجو کے کمزور ہاتھوں سے تھوڑی بہت سیاہی میز پوش پر گر کر آہستہ آہستہ پھیلنے لگتی۔ کرسیاں جن پر افسانہ نویس آکر بیٹھے عجب بے ڈھنگے طور پر ڈھی ہوئیں۔ اپنے افسانے کی تعریف میں ایک آدمی کلمہ منہ کے عادی افسانہ نویس دفتر کی خاموشی کو دیکھتے اور اپنے شوانی کاؤں میں انگلیاں ٹھوس کر چل دیتے۔ پھر وہ دھینوں اپنے نادر افکار نہ بھیجتے۔ بعد میں مجھے ان کے سامنے گڑاٹا ہوتا۔ کچھ سے ہوتے ردی کاغذ جنہیں میرا صفائی پسند معاون عام طور پر اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا کرتا تھا۔ ویسے ہی کچھ سے پڑے رہنے اور دفتر پر ایک طائرانہ ٹکاؤ ڈالنے سے یہی معلوم ہوتا جیسے اس دن ہم غیر معمولی طور پر مشغول رہے ہیں۔ گویا جذبہ باقی ایڈیٹر کسی معرکہ الاکرا کہانی پانے پر میز کے ارد گرد ناچتا رہا ہے اور شاید جذبات سے مغلوب ہو کر کاغذوں، مسودوں، فائلوں کو اٹھا اٹھا کر چھت کی طرف پھینکتا رہا ہے۔

تیمبر لال کا اشتہار فراہم کرانے کا طریقہ بالکل نیا تھا۔ وہ آرکیٹیک کے طریقے اقتصاد ہی حالات، مقامی باشندوں کی معاشرت اور ان کے خرچ کرنے کی اہمیت سے واقف تھا۔ نفسیات میں فطری طور پر دخل رکھنے کے عجب وہ کہانی کے سے گمنام اور نئے پرچے کے لئے اشتہار فراہم کرتے ہیں کامیاب ہو جاتا۔ بلاک بنانے اور مچاپ خانہ میں کام کو چکنے کی وجہ سے وہ طباعت کے عمل اور انگریزی ٹائپ کے رخ کر بھی جانتا تھا۔ وہ اشتہار کر باقاعدہ دو یا تین حصوں میں تقسیم کیا کرتا۔ معلقہ کے حصہ کا کام وہ ایک خاص صورت کو دے کر دل پسند کام لینے کے علاوہ کمیشن بھی انتہا کرتا۔ ایک دفعہ تو اشتہاری مضمون اور تصویر کے پیشٹ کر دانے کی سرور دہی اس نے محول سے لی۔

کسی دوست کی وساطت سے پچھلے ماہ اس نے چند ماہ کے لئے ریوے کا مکمل صفحہ لا اشتہار لا کر خاصی آمدنی پیدا کر دی تھی اور وہ آمدنی ادائل عمر میں کہانی کو ایک بہت بڑی مدد تھی۔ اس بات کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ تمبر لال نے کہانی میں جان ڈال دی تھی۔ اس کی محنت ہی رسالہ کی کامیابی تھی۔ اس کے استعداد کی وجہ سے مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا تھا۔ کہ تمبر لال کہیں دفتر چھوڑ کر ہی نہ چلا جائے۔ چونکہ وہ خود بھی لکھنا جانتا ہے اور اشتہار بھی فراہم کر سکتا ہے۔ کہیں وہ اپنا ہی کوئی رسالہ نہ نکال لے۔ چنانچہ اسی خوف کے رد عمل نے مجھے پیش قدمی پر مجبور کر دیا۔ میں نے کہا۔

”باپو تمبر لال تم اپنا ہی کام کیوں نہیں چلا لیتے۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں تم کام اچھی طرح سے نباہ سکتے ہو، معقول آمدنی کا ذریعہ پیدا کر سکتے ہو اور پھر۔۔۔۔۔ جب کمٹاری ساٹھ کی اسپیش ہے۔“

پھر میں نے خود ہی کھسیا نہ ہوتے ہوئے کہا۔

”اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ مجھے ایک معاون کی ضرورت بھی تو نہیں رہی۔“

تمبر لال اس جملے کو متعدد بار سن کر تنگ آ چکا تھا۔ اس لئے شپٹاتے ہوئے بولا۔۔۔

”ضرورت نہیں۔ تو مجھے بار بار کیوں سناتے ہیں آپ؟ کیوں نہیں

مجھے۔۔۔۔۔“

اور خبر بات کو مکمل کئے تمہیر لال خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا۔
جیسے وہ تلخ سخاقت سے دوچار ہونا تو کہا اس کے خیال سے بھی گھبرا آتا ہو۔ میں ہو کہ دو اہل اس
کی علیحدگی کو بغیر اپنے آپ کو گزند پہنچاتے گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ یوں لاپٹا۔ جیسے
مجھ پر یک لخت کسی نے سر دہانی انڈیل دیا ہو میں نے اپنی بات کو بدلتے ہوئے کہا۔
”آج کل تو ضرورت ہے۔ مگر مستقل طور پر تو نہیں۔ بابو۔ بابو۔۔۔ میرا مطلب
مجھ گئے تم؟“

پھر مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا میری بات تشنہ تکمیل ہے۔ کچھ دیر بعد میں نے
اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا۔

”میرا مطلب ہے۔ تم کہوں اپنا کام چلا کر ایک معقول آمدنی کا ذریعہ نہیں بنا
لیتے؟“

نظارہ میں نے وہی بات دہرائی تھی۔ لیکن اسے کہہ دینے سے میں نے دل پر
سے ایک بوجھ سا اٹھا دیا تھا۔

میرے معارف نے اپنا زور اور قوت غم سے گرا ہوا چہرہ اور اٹھایا۔ اس نے
کچھ کہنا چاہا مگر اسے کھانسی شروع ہو گئی اور ایک کانٹا سا اس کے گلے میں کھٹکنے لگا۔
اس نے منہ اور ناک پر رد مال رکھ لیا۔ تاکہ ہوا مجھ تک نہ پہنچ کر آئے۔ پانچ منٹ تک
آہستہ آہستہ مگر لگاتار کھانسی رہنے سے بابو تمہیر لال کو اسنے لگا۔ جب ذرا دم سیدھا
ہوا تو اس نے باتیں بات سے چشمہ اٹھا کر پیشانی پر سرکایا۔ اور میری آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر کہنے لگا۔

”لیکن کام کے لئے کچھ مراستے کی ضرورت ہوتی ہے“

”میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: تعجب ہے کہ تم اکیلی جان ستر روپے خرچ کر ڈالتے ہو؟“

پتمبر لال نے بات کرنے کے لئے حلق میں کھٹکنے والے کانٹے کی ٹوٹے سے رباتے رکھا اور نتھننے بھلاتے ہوئے بولا۔

”آپ کو کس نے ہلکا دیا کہ میں اکیلا ہوں۔ میری ایک بہن ہے، شادی کے قابل، اور ایک بیوہ بڑا ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ گواہاں باپ مر چکے ہیں۔۔۔۔۔ اور جناب! شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ آٹھ آنے کا تو وہی پالش آتا ہے جو کہ اچکن پر لگے ہوئے ٹینوں میں پمک پیدا کرتا ہے؟“

اور اس بات کو سخت نفرت سے کہنے پر پتمبر لال ذرا بھی نہ بھجکا۔ اس کے بعد اس نے اپنا دجا پتلا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ پلو سے روشنی کے خلاف پتمبر بابو کی پردہ فائل بہت ہی عیب دکھائی دیتی تھی۔ اس نے بات کیا کی۔ مجھے ایک سچیت لگا دی۔ جس کے سبب بغیر چارہ نہ تھا اور ابھی تو اس نے ذاتی خرچ کی ایک مدد ہی بتائی تھی اور پھر اس کی بہن جو سکول میں پڑھتی تھی۔۔۔۔۔ اور بیوہ بڑا۔۔۔۔۔

میں نے دل میں خیال کیا کہ میں نے اس کو عمر بھوکے سے بہت کچھ لیٹا ہے اپنی تمام خودکاری اور خود اعتمادی کے ساتھ وہ مجھ سے کہیں بڑا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ میں اس کا ذکر معلوم ہوتا ہوں۔ اس کے انداز گفتگو پر مجھے غصہ محض اس لئے آیا۔ کہ آخر میں آقا تھا۔

اس کے بعد میں نے پتمبر بابو کو کچھ نہ کہنا چاہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کے خلاف طبیعت کوئی بھی بات ہونے پر فضا کدر ہو جائے گی اور میرے دل کا چین

اور راحت چند گھنٹوں کے لئے بالکل فنا اور برباد ہو جائے گی۔ پتبرلال کے تمام دن کبیدہ خاطر رہنے اور کام میں دلچسپی نہ لینے سے تمام فائیں میز پر کھلی پڑی رہیں گی۔ مہول کرنے والے بل مہول شدہ بلوں میں پروتے جائیں گے۔ سنے آرڈروں والی چٹھیاں تعمیل شدہ آرڈروں کے ساتھ ردی کی ٹوکری میں جا پڑیں گی۔ گیسری کھینچنے کے لئے فٹ ردل باوجود وگوشش کے نہ مل سکے گا۔ ڈاک خانے میں جانے والے دی۔ پی پیکٹ پر کوئی رقم اور فارم منی آرڈر پر مختلف رقم لکھے ہوئے پر ڈاک خانے کا نمبٹ سب پوسٹ ماسٹر چٹراسی کو تمام دی۔ پی واپس کر دے گا تاکہ دفتر میں جا کر درست کرائی جائیں۔ ان تمام باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے چپ ہی مناسب سمجھی۔ یہ نہ صرف پتبرلال کے لئے اچھا تھا۔ بلکہ میرے اپنے لئے بھی۔ محض ذاتی مفاد، خود غرضی سے میں خاموش رہا اور میں اتنی دیر چپ رہا کہ مجھے کھلی ہونے لگی۔

کچھ عرصہ بعد میں نے کہا: "بابر... جب تک میں نہ کہوں کہ منی آرڈر کے کرنوں کا اندراج کرو تب تک تم سوتے رہو گے۔ خود بخود نہ کر دے گا کیا؟" پتبرلال نے جواب دینا چاہا۔ مگر اسے جھینک اٹھی اور پھر مکی مکی کھانسی شروع ہو گئی۔ پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ تو سانس لینے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ بات کیا کرتا۔ اس بار وہ ہفتہ بھر خاموش رہا۔

پتبرلال کی شخصیت نے ہی واصل مجھ میں احساس ذات پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس سے پہلے زندگی کی مختلف موڑوں میں مجھے کئی ایک خوشگوار اور ناخوشگوار ملازموں سے بالا پڑا تھا لیکن کسی کے سامنے مجھ میں اتنا اپن کی نوا تھی شدت سے نہ ہوئی تھی جتنی کہ تو

یہ ہے کہ یہ میرا پناہی احساس کمتری تھا جو بھروسہ یابن کر مجھے ستاتا تھا۔
 کچھ یوں کے اشتہار حاصل کرنے کے لئے میں نے پچھلے ماہ چند ایک اضلاع کا دورہ
 کیا تھا اور مضمون کے سامنے اشتہار حاصل کرنے کے لئے گڑبڑایا تھا۔ لیکن اب تک صرف
 دو اشتہار ملے تھے ان میں سے ایک سینئر سب نج گندووا سپور کا تھا جو کہ شریف اور غلیق
 نج نے اسی وقت دے دیا تھا اور دوسرا تحصیلدار صاحب توگا کا تھا جنہوں نے عنقریب
 ہی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

دسمبر کا آغاز تھا اور میں جانتا تھا کہ کرمس کی گیارہ چھٹیاں ہو جانے پر ان سرپرستوں
 کی طرف سے پھر ہماری طرف کوئی بھی متوجہ نہ ہو گا۔ اسی لئے میں کچھ گھبرا سا گیا۔

ان دنوں پیمبر لال کچھ خوش تھا۔ میں نے احمقیاں چندوں سے اپنے آپ کو
 اس کے راستہ میں آنے سے باز رکھا۔ وہ کاغذ کو اوپر نیچے کرتا ہوا سیٹیاں بجاتا تھا۔ شاید
 اس لئے کہ ”وتیا“ کی لاٹری سے اسے تیس روپے آتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس
 بات کا معترف تھا کہ ان روپوں کے تصرف کے متعلق سینکڑوں خیالوں نے اس کے
 ذہن کو پریشان کر دیا تھا اور اس کی نیند چھین لی تھی۔ اگر کوئی بات صحیح معنوں میں اسے
 سکون دیتی تھی۔ تو وہ یہ کہ اس کی بہن سکول سے نکلتے ہی ایک زمانہ صنعتی سکوں میں
 چھوٹی ردیوں کو سلائی اور کڑھیاں سکھانے پر نوکر جو گئی تھی اور اس وجہ سے پتھر
 بابو کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی خوشی کو دیکھ کر مجھے عدالتی اشتہاروں
 کا خیال بھی بھل گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا: کیوں... کیا بات ہے بابو؟
 ”نہیں... ہونہی... پتھر نے گدگدی موسم کرتے ہوئے کہا۔“

اس کے بعد پتھر نے وہ ایک چپت باتیں کیں۔ میں نے خوشی جو کر کہا ”یہ بہت

اچھا ہوا جو تمہاری بہن صنعتی سکول میں جانے لگی ہے۔ کیا مشاہدہ ملے گا؟
ایک پُر غرور انداز سے پتھر بولا ”بھیس روپے ماہانہ . . . مجھ سے بھی
آٹھ روپے زیادہ“

اس وقت مجھے یوں دکھائی دیا۔ گویا فضا میں ایک خلا و سا پیدا ہو گیا ہے۔ جسے
پُر کرنے کی اشد ضرورت ہے اور کمرے کی تصویریں اور کنز لے اپنی اپنی جگہ سے ہٹ
گئی ہیں اور میز پر پڑا ہوا قلم دان اپنی جگہ سے بہت دور مرک گیا ہے۔ فائیں قدرے
بے ترتیب رکھی ہوئی ہیں۔ اور سب کچھ میرے ایک معمولی اشارے سے اپنی اپنی
جگہ پر چلا جائے گا اور پھر میرے دل پر سے ایک بوجھ مارتا جائے گا۔ چنانچہ میں نے
اپنے کو کہتے ہوئے پایا:

”اب تو تم اپنی مشترکہ آمدنی سے کوئی اخبار جاری کر سکتے ہو۔“

پتھر لال نے ہنستا بند کر دیا۔ وہ بہت رنجیدہ بھی نہ ہوا۔ گویا وہ میری ناقابل حلاج
طبیعت سے مانوس ہو چکا ہو۔ صرف چند ایک تیور اس کی پیشانی پر نمودار ہوئے
اور وہ کھانستے ہوئے بولا۔

”کہاں؟“ ————— اس کی تنخواہ تو ہم اس کے بیاہ کے لئے
اکٹھی کیا کریں گے؟

پھر جیسے پتھر کو کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ وہ کٹ کر اٹھا اور برآمدے میں
جا کر اپنی تنگی کو سگریٹ کے دھوئیں سے پیدا ہوتے ہوئے عقلموں میں مذب کرنے لگا۔
اس کی میز پر بہت سے کاغذ کبھرے پڑے تھے۔ گویا وہ ابھی ابھی کچھ لکھتا رہا ہو میں نے
ڈرتے ڈرتے ایک سرسری نظر ان کاغذوں پر ڈالی اور مجھے یہ دیکھ کر کچھ حیرانی اور کچھ

خوشی ہوئی کہ عدالتی اشتہاروں کی بات جو چند دنوں سے مجھے سرسید کر رہی تھی۔ پتھر بھی اس کا حل سوچنے میں مصروف تھا۔ لیکن وہ چٹیاں جو اس نے دلیری سے سفوفوں کے نام لکھی تھیں۔ ان میں دوستانہ طریقہ تھا طلب کو میں نے پسند نہ کیا۔ میں نے براہِ دے سے پتھر کو بلاتے ہوئے کہا۔

”پتھر بابو! وکیونہ نا منصف اور ج کا وعدہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان سے ایسا دوستانہ تھا طلب کچھ اچھا نہیں لگتا؟“

بابو اس انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ گویا اس کے سامنے کوئی نہٹ گنوار کھڑا ہو۔ اور بولا۔

”معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے پر کچھ بھی اعتماد نہیں ہے۔ آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ جو نازم کتنا ارفع پیشہ ہوتا ہے اور سماج کے کتنے بڑے بڑے ارکان اخبار والوں کے وصیت تعاون کے محتاج ہوتے ہیں اور پھر ایک وکلاء کی حیثیت سے تو یہ لوگ پاس بھی نہیں پھٹکتے دیتے۔۔۔۔۔ ان لوگوں کے سامنے ہیں غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ ان لوگوں سے ایسے ہی تعلقات پیدا کر لے پاتے ہیں گویا ہم رتبہ میں ان سے کسی طرح بھی کم نہیں؟“

”کچھ بھی ہو“ میں نے اپنی بات کی رٹ لگاتے ہوئے کہا ”میں اس طرزِ تھا طلب کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ بھی دیکھ لینا؟“

اس کے بعد میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن پتھر کا چہرہ بخیر لگی اختیار کر گیا۔ اس نے میں پور کر خاموش ہو رہا۔ ۲۶ دسمبر تک میں چھ عدالتی اشتہار معمول ہو گئے۔

x x x x x x

تمام وہ لوگ جو کسی بھی مفاد کے لئے شب زندہ داری اختیار کرتے ہیں۔ ان کی بیویاں اعلانیہ طور پر انہیں کو سنے دیتی ہیں تاہم قہقہہ اپنی محنت کے اجر کا خوبصورت سائیکل جس میں خوب صورت ساڑھیاں بھی دکھائی دیں اور بچوں کے لئے گاڑی بھی۔ ان کے سامنے پیدا نہ کیا جائے۔ وہ شب زندہ داری سے متعلق نہیں ہوتیں۔ میری بیوی کی ناراضگی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ میں اسے یہ بھی نہ بتا سکتا تھا۔ کہ صبح فلاں مہتری پکائی جائے اور شام کو فلاں دال اور ہر ایسی بات پر اکثر گھر میں ناخوشگوار سی بھڑپ ہو جایا کرتی تھی۔ آج میں گھر سے ہی بھڑک کر سونے کے لباس اور سلیروں میں دفتر چلا آیا تھا اور روئی بھی دہیں منگوا لی تھی۔

ردئی کھاتے وقت مجھے یہ خیال ستارہا تھا۔ کہ آٹا بھی ختم ہے اور گھی بھی۔ اور شام کو کیا مہتری پکائی جائے؟

وائے قسمت آج پتھر لال پھر ناموش تھا۔ نہ معلوم اس کی الجھن شخص کے جذبات کو کس نے غشیں لگائی تھی۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ کم از کم اس دن میں نے تو اسے کوئی تحفہ کوئے والی بات نہ کہی تھی۔ آج وہ گھر سے ہی ایسے آیا تھا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ پتھر بابو کی بہن مسلسل بیماری کی وجہ سے صنعتی مکول کی ملازمت سے علیحدہ کر دی گئی ہے۔ پتھر کے پاس جو کچھ تھا۔ وہ سب کچھ دوا دار پر ختم ہو گیا۔ اب اس کے پاس علاج معالجہ تو ایک طرف ہیٹ کی آگ خاموش کرنے کے لئے بھی کچھ نہ تھا اور وہ دو دن سے مجھ کا تھا۔ بعض وقت بے نصیب انسان کو قدرت محض اس لئے کچھ دیتی ہے تاکہ پھر اس سے چھین لے۔ قدرت اپنی حریفہ تمثیل کو مقام اور تک پہنچانے کے بہت سے طریقے مانتی ہے۔

گرمی

اس دن بھی میں تمبر لال سے خائف، ایک کونے میں دبکا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا "میں تمبر لال سے اتنا خائف کیوں ہوں؟... آخر وہ میرا نوکر ہی ہے نا؟"

اس کے بعد ایک زبردست رد عمل میں میں یہ بھی مہول گیا۔ کہ تمبر دودن سے مہول کا ہے وہیں نے مڑ کر کہا۔

"بابو... آج شام کو کچھ سبزی اور آٹا تو میرے گھر پہنچا آنا... پیسے میں دیتا ہوں۔"

اور میں نے اس کا جواب سنے بغیر پیسے میز پر رکھ دیئے میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر تمبر لال کی جگہ کوئی اور دفتر کا ملازم ہوتا تو شاید میں اس سے یہ کام بھی نہ کھتا...
... تمبر لال سمیرت سے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا رنگ بد ہونے لگا۔ شام نے پھر کٹنے لگے۔ دو بولا۔

"لیکن سنا ب — آپ نے دفتر کے کام کے لئے مجھے رکھا ہے...
... نہ کہ بچ کے لئے۔ معاف کیجئے مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا؟"

میں نے کہا "کام سرن ہندو ہنٹ کا تو ہے اور میں تمہیں دفتر کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے بھیجتا ہوں"
"خو ادو گھنٹہ کی چھٹی دیں۔ یا دفتر کے وقت کے دو گھنٹہ بعد تک بٹھائے رکھیں۔
لیکن یہ کام مجھ سے نہ ہو گا؟"

"آخر اس میں حوج بھی کیا ہے؟"

"دفتر کے کام اور بچ کے کام میں بہت فرق ہے؟"

گڑھن

”فرق ہے!“ میں نے غصے میں لاپتہ ہوئے کہا: ”آپ جان بوجھ کر
رزق کو دھکا دے رہے ہیں۔“

”بے شک“ مجھے دلیرانہ جواب ملا۔

”کل مہینہ ختم ہوتا ہے۔ براہ مہربانی اپنا بندوبست کر لیجئے۔“

اس وقت میری نظر کہانی کے تازہ ترین شمارے پر پڑی۔ اس میں اودھاری لنگ
میٹر تھا اور اودھاری اشتہارات اور یہ جو کچھ بھی تھا۔ تمبر لال کی محنت کا نتیجہ تھا۔ مجھے
یقین ہو گیا کہ اب کہانی کے رٹا پے کے دن آ گئے۔

اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ تمبر لال کے سامنے اپنے رویے پر اظہارِ معذرت
کروں اور اسے کہہ دوں کہ وہ بات صبح کے ناخوشگوار واقع کی وجہ سے ہو گئی ہے۔
لیکن آقا نوکر

میں اس بات کو سوچتے ہوئے برآمدے میں چلا گیا۔ پیچھے دے میں نے قفل لگنے کی
آواز سنی اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے چابی تالے کے قریب پڑی ہوئی دکھائی دی۔
اس وقت تمبر بابو لمبے لمبے ڈنگ بھرتا ہوا بانسہ کی طرف ہوا۔

اس وقت میں کناٹا بھی نوکری چھوڑنے کا خیال تمبر کے دہن میں پیدا نہیں کرنا
چاہتا تھا۔ میں باواز جند پکارا۔

”تمبر..... تمبر بابو، چابی لینا بھول گئے تم۔“

تمبر چلتا گیا۔ میں نے سوچا۔ کیوں نہ میں آقاؤں کو ہمیشہ کے لئے پامال کر دوں۔
اسی سونے کے کپڑوں اور سلیپروں میں اس کے پیچھے دوڑ جاؤں اور گروگر اور معافی مانگ
لوں۔ راستہ میں میرا سلیپ کچر میں دھنس کر رہ جاتا ہے۔ تو رہ جاتے کسی کار کے پائڈان

گگھن

مے ملو کہ بیڑی پر اوندھا گر پڑتا ہوں اور میرا سر بھٹ جاتا ہے تو بھٹ جائے۔
 آخر آقا پن اس سے کم ذلیل ہونے پر مقور سے ہی معدوم ہوتا ہے۔
 اور جب میں نے دوڑنا چاہا تو میرے پاؤں زمین میں گر گئے، جوڑ پر پہنچتے
 ہوئے تمیر نے صرف ایک دفعہ میری طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ . . . ”یہ ٹھیک
 ہے میں مہو کام رہا ہوں، لیکن اپنی جیب میں کسی کی چابی کا بوجھ مجھ سے بھی
 برداشت نہ ہو سکے گا“

پچھلے دن

اب وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کسی کی تنقید ہی نہ ہو نہ ہی نہ پتی تھی۔
 وہ ہے کے بڑے کیوں والے، بلند شہری پیمانے کے تھے، جہاں ڈھور کا سارا گوبر
 کھجرا پڑا تھا اور اس کی بدبو، لکھ کی دھند کی طرح، سطح زمین کے ساتھ ساتھ تیر رہی تھی، جہاں
 اس کی بہن ایک منجھلی میں، گلی کی کسی زچہ کے لئے لگائے کا پیشاب لے رہی تھی۔
 لیکن سکھانے تو، ان کا منہ، پہلی ہی میں دیکھ لیا تھا۔ اس پچھلے کے بڑے بڑے
 اور گھر سے داغ تھے۔ جیسے اس کے میکے ماتن بیل کی موٹی ریت پر بارش کے بڑے
 بڑے قطرے پڑے ہوں۔

اس نئے گھر کا رہن سہن گنتا پرانا تھا اور یوں بھی کچھ سوچہ واسے ہاتھوں کا محتاج
 — دیواروں میں رنجیت شاہی جھوٹی امینٹیں، بوڑھے کالا کے دانتوں کی طرح

گرھن

اپنے سرے ہوئے جبروں میں علیحدہ علیحدہ اور باہر ابھری ہوتی تھیں۔ دیواروں کی ٹیپ — سن! اس اور چونا برس ہوئے اڑ چکا تھا۔ ایک دیوار پڑی اور بھوسہ ملا کر لیپن کیا گیا تھا۔ پھر اس پر چونا پھیر کر گہرے رنگ سے بڑے بڑے اور بد زیب ناگری حروف لکھ دیئے گئے تھے۔ بھنڈارے کے قریب، ہنڈیا پر ہر بائیسوی ایک بے محل اور بے سزا گانا گارہی تھی — آپس (گناہ) کی ست باندھو گھڑیا۔۔۔۔۔ بے چاری مہربا! وہ ان گناہوں پر نادم ہو رہی تھی جو اس نے کبھی نہیں کئے تھے، جو وہ کرنے کے اہل ہی نہ تھی۔ یا شاید وہ یہ گانا اس لئے گھا رہی تھی کہ چھوٹے لالا کی شاوی پر اسے بہت تھوڑا لاگ ہوا تھا۔

”ارے اولالا! تو کیوں کھڑا ہو رہیا گوبرماں؟“

گھر کی اماں نے آواز دی۔ اس وقت بڑا لالا ناریل کا دم لگاتے ہوئے صحن میں کھڑا اماں پر منہس رہا تھا — اب رام نام کے بعد میا نے کٹی کر دی۔ بھلا کیا لا بھرا اس پر جاباٹ سے؟ رام نام ہی کٹی کر دیا۔ دہا ری اماں!۔۔۔۔۔ جپ سے! گھر کی اماں نے ایک بھونڈی مسکراہٹ سے کہا اور پھر پوجا کی آخری قسط پوری کرنے کے لئے بڑھیا نے پستل کی ٹوٹی سی ٹٹیا اٹھائی اور صحن کے مہوت برہمن — پستل کے سرور میں ٹھمکتے ہوئے پاؤں پر برف کا سا ٹھنڈا پانی گرا دیا پستل کا نپ اٹھا۔ شاید یہ پردا بھونٹا تھا۔ پھر پیر کے گھیرے میں سولی کا سرخ اور زرد سا لگا لپیٹ دیا۔ بڑے لالا کا چھوٹا لالا بہت نٹ کھٹ تھا۔ اسے چھوٹے بڑے، گلی گواہنڈ کے سب صاحب دکتے تھے گھر کے سب لوگوں کے احتجاج کے باوجود اس نے ایک میا پتہ پال لیا تھا اور باپ دادا کا جھم بھرٹ کر دیا تھا۔ صاحب اٹھا

گرمی

توقہ بھی ساتھ ہی۔ اٹھتے ہی پتے نے انگریزی لی، منہ کھولا، زبان چمکائی، دھواں سا اڑایا اور صحن کے میل کے چروں میں چبچ، ایک ٹانگ اٹھا، اپنے واحد طریقے سے پروجا کر ڈالی۔

سکھیا کے سر میں رات کے سو میل کے چکر باقی تھے۔ لاری کی گھوں گھوں بھر ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اسے گھیرے آ رہے تھے۔ بڑی نند نے سینی کی ایک پیٹ میں لیوں کا اچار لار کھا تھا۔ آ، ہا، پھی اسکیا نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ یہ لوگ چینی کے مندر استعمال کریں۔ انہیں جھوٹے برتنوں میں کھانا کھویں۔ لیچہ مسلمانوں کی طرح۔ پھی! ابھی بہن! جاتو ذرا، سکھیا نے قریب کھڑی لان کی بجائے کو کہا۔ کوئی مراد آبادی کوٹرا نہیں تمہارے بیاں؟ اس میں تو لے آؤ تھوڑی سی چاٹ، مثلی رک جائے۔ فوراً میں چینی دینی کے برتن میں ناکھاتی۔ اور وہاں ناک پڑھا، بلکایاں لینے لگی۔ بڑی نند بھی میں خوش ہوئی۔ اماں تو بوڑھی ہو گئی۔ وہ تو جھوٹے برتنوں اور دوسروں میں فرق کیا دیکھے گی لیکن یہ۔۔۔۔۔ اب اس نیا کاکھو یا آگیا گھر ماں با

نند نے اپنی پیٹ اٹھائی اور ٹل گئی۔ بند شہری چھانک کی ادٹ میں کھڑے وہ سکھیا کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ انگریزی طرز کے بال کٹا رکھے تھے۔ نند کہہ رہی تھی مکمل ٹو سے بی، آپاس کیا جیرا منے۔ گھر سے پرے شہر میں انواروں کے مکان (لودر ٹنگ) میں رہتے تھے۔ جینو بھی ناپہنتے۔ سر پہ چپلی بھی ناکھتے، سکھیا نے ہی میں کہا، یہ لیچہ دیا ہے نا۔۔۔۔۔ یہ رگریری (انگریزی) اور پھر ان چمک کے داغوں کا کیا ہوگا؟ جب یہ خوفناک منہ قریب آئے گا تو طبیعت بہت گھبرائے گی۔

گومن

اور کوئی نہیں کا اچار کام نہیں آوے گا۔ سب سو رہے ہوں گے، سب کچھ مجھے اکیلے ہی بھگتنا ہوگا۔ کیا دیکھا ان لوگوں کا چاچا نے؟ مجھے گھور زک (دور زک) میں دیکھیں دیا اور پٹنگ پر پڑی، سکیمیا سرز انڈوں میں دبا روئے لگی۔

محلہ ہجاری کی عورتیں ابھی تک دامن کا کھوا کھوتا پر کھنے آرہی تھیں۔ دامن کھری تھی، پانے کا سونا جس و حرم کاٹنے میں کونسل جاتے۔ اسے منہ سو رہے دیکھ کر آپ بھی منہ سو رہے تھیں۔ ————— سچ ہے، ماں باپ بڑی دولت ہے کیسے جھوٹ

ہائیں ایک دن میں؟ ایک عورت بولی، جب میری سادی ہوتی تھی تو ————— اس کے بعد وہ عورت سکیمیا سے بھی اونچے سسکیاں لینے لگی سکیمیا حیران تھی۔ اس نے اس وقت تو ماں باپ کو یاد نہیں کیا تھا اور اس آؤ کلز عورت کا نچلا ہونٹ اونٹ کے ہونٹ کی طرح ٹٹک گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس آؤ کلز کو آپ ہی جیا بسادی کے گھر روٹنے کا آٹنگن عکس ہونے لگا۔ اپنے دوپٹے سے کس نے آنکھوں کا سیل پونچھ لیا۔ ————— دنیا کی یہی ریت چلی آئی ہے، بڑا تو سکھ ہاں کا مانگ، اتنا ہے گا کا تو گود پ ہیں اور بے رام تو بیٹیوں جیسا بیٹا ہے۔ جیان کا رہا ہے منہ میں؟ رات کو رات کے، دن کو دن ————— ناہے گا تیرے اسارے!

آج بڑا شہد دن ہے۔ گھوکی اماں بولی۔ لگی میں جو امر تو ہے نا۔ اس کے ہاں بالا ہوا۔ تیرہ دن ہوئے پنجابیوں کے ہاں بیٹا ہوا۔ تبھی وہ آج گورڈر کھائے کا پیشاب، نندا دے کے نئے لے گئی۔ یہ پھیل بیٹوں کی ہے۔ بیٹوں کی ہمارے اور مساویوں کی۔ اہ ہر بیٹا ہوا اور ہر سادی ہوئی۔ اری بسدہ کی ماں۔ کلاں ربا تیرا صاحب؟ بڑی ہو گھر آئی تو میں نے تیرا صاحب گودی ڈالا تھا۔ اور پتلے تین بیٹے

ہوئے منجمل کی گودی میں بٹھایا تو پٹک پہلے سال لالا اور دوسرے سال بٹو۔ لیکن بٹو کا بری ہے۔ لالا سے بھی زیادہ مہووسے۔ گودی ہری چلتے اور کاں ہے وہ؟ میں اسے دہن کی گودی میں بٹھاؤں ہوں۔

سکھیا گھٹسری ہو گئی۔ بیٹا اور چھپک کے داغ! گوجر ڈھور کھونٹے کے ستے آگیا تھا اور ایک کمین نگر نگوٹا کس صحن کو بھاڑے سے سات کر رہا تھا۔ وحنڈ شراتے ہوئے سورج کی کرنوں میں مل رہی تھی۔ اور بدبو کمین کے تیج نے سمیٹ لیا تھا۔ وحنڈ کا گھونٹ اٹھتے ہی صبح کا پاند سا کھڑا دکھائی دینے لگا۔ قصبے کے مچھڑے، بٹ کر، پنجاہیوں کے ہاں اور اوہر گانے بجانے پلے آئے۔ اس وقت اسر تو کے ہاں جمعدارنی سرس باندھ رہی تھی۔ سکھیا سبھی کچھ دیکھتی تھی لیکن اسے سب کچھ لائے کو دڑتا تھا۔

صحن کے دھوئے جانے سے پہلے اور پہلے کو چکلا تے ہوئے بڑے بھیتا کے پاس چلے آئے۔ لیکن بیاں بھی ہی دکھاتی دیتا تھا جیسے چھپ رہے ہیں اور اپنا چھپ سے بھرا ہوا چہرہ خور ہی دکھانے لے چکپاتے ہیں سکھیا کے دل میں کچھ رحم سا پیدا ہو گیا۔ رام کسی کو بد صورت بھی نہ بنائیں۔ اپنے آپ سے شرم آتی ہے۔ مانتی ہوں، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ لیکن میرا کیا قصور ہے؟ میری شکل سے تو عورتیں ملتی تھیں اور ان کی شکل سے تو بھوت بھی نہ ملیں۔

بڑی سند مراد آبادی رتن میں اپار ملے آئی سکھیا نے اپنی سنی پٹی انگلیاں کشیری فرد سے باہر نکالیں اور اپار کی طرف بڑھائیں۔ تندے بھالی کی انگلیاں دیکھیں اور پھر اپنی موٹی گونجی کے ٹنٹھر کی سی انگلیاں، اور بولی جیرام نے تو کوئی موتی وان کتے میں پھینچے تھے۔

سرسرہوں کی نازک سی نازک اور لابی انگلیاں ہیں سج بنایا سکھیا بھابی۔ کون سانچے میں فعال نہیں تم؟
 اتنا پریم؟ سکھیا سوچنے لگی۔ یہ رشتے ہی کچھ ایسے جوتے ہیں۔ آپ اپنی آپ اتنا پیار ہو جاتا
 ہے۔ اس کی خاطر سب کچھ اچھا مٹنے لگتا ہے۔ اس کے لئے سب سے سزا بھائی، دیورانی، ہند،
 نندوئی بھی کی سنی پڑتی ہے لیکن جب دینی ایسی صورت کا ہو تو کس کی سب سے کما آدمی؟
 انیم کا گولا کھا شور ہے!

”تو برتن ہلے گی؟“ نند نے پوچھا۔

سکھیا چپ رہی۔ وہ اس رسم کو ادا کرنے سے شرماتی تھی۔

نند نے سکھیا کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور منہ کو ادا پر اٹھا دیا۔ آنکھیں بند تھیں۔
 جیسے بہت ریس آ رہا ہو۔ ہونٹ سیپ کی طرح ملے ہوئے تھے۔ اوپر کے ہونٹ کی کمان کتنی
 اچھی دکھائی دیتی تھی۔ نند نے کہا۔

”اچھی! ایک بات بتا۔“

سکھیا نے سوال کی صورت میں آنکھیں کھول دیں۔ نند نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب عورتیں
 اپنے اپنے کام میں مشغول تھیں۔ ”کیا جیرام نے تجھے دیکھا ہے؟“ وہ بولی۔ سکھیا کا جی پٹا کھردر
 پڑا۔ کون جیرام؟ اور پھر بڑا مزہ رہے لیکن اس نے منہ پر لے لیا۔ اور گھٹری ہوئے لگی۔
 نند ایک دیہات تھی اور زیادہ طاقتور، اس نے ولین کو سکاڑے نہ دیا۔ اور پھر اپنا سوال اٹھرا
 دیا۔ سکھیا نے جان چھڑانے کے لئے ہاں میں سر ہلا دیا۔

اسی شادی کے سلسلے میں کسی رسم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شاید وہی برتن بانٹنے تھے۔
 پر اس میں دو دھادہ پانی ملا کر کچھ روپے بھی رکھ دیتے تھے۔ لگا لگا لوہان کی گتھی لے گئے تھے۔
 اس میں روپے ہی روپے تھے۔ تاکہ سکھیا ایک مٹھی میں جی بھر کر روپے نکالی لے۔ نند نے بتایا۔ ابو کا

ہاتھ بہت نازک ہے۔ کاکا جی ہی جی میں خوش ہوئے۔ ایک ہاتھ میں ہوا زیادہ سے زیادہ ساٹھ روپے نکال سے گی۔ کاکا کے قریب نندولی کھڑا تھا۔ وہ گھر کا داماد تھا چھوٹا نندولی، اس کا حریف نہیں آیا تھا۔ اس نندولی نے سر پر لعل کا پورا ایک نقان لپیٹا ہوا تھا نیچے لمبا کوٹ، وہ بھی لٹے کا اور کمرس آدمی دھوتی نے اسے بہت مضحکہ خیز بنا دیا تھا گھر کا داماد ہونے کی وجہ سے اس کی بہت پوچھ سوتی تھی۔ دگر نہ وہ قوراً بگڑ جاتا تھا اور اس محترم آدمی کے بگڑنے سے کبھی ڈرتے تھے۔ ایک حیرام اس سے نہیں ڈرتا تھا۔ اسے نندولی کے وجود سے شرم آتی تھی۔

سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے سکھیا کے کمرے کی کھڑکی سے دو زمین کا اوپر نیچ اور شیرہ کی ان دھکی چھاتیوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ان ٹیلوں کے قریب رکھی کھیت کی پیٹری سر کی ہوائی گلیاں بن گئی تھی۔ زمین اپنی عریانی کو چھپانے کے لئے دھندلی جاوڑی بیٹی تھی لیکن سوچ اس کی ساری یاد رکھنے لیا تھا۔ آخر زمین بے بس ہو کر پڑی رہی۔۔۔۔۔
 یہ اب اور قریب آگئے تھے اور سکھیا انہیں اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔ وہ دو منٹ کے قریب ایک نمک حیرام کو دیکھتی رہی۔ حیرام کرا ایک اور عادت بھی تھی۔ وہ پل و پل کے بعد سر کو ایک عجیب سا دیتا تھا۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ اور آجوا یا شاید اسی لئے حیرام عورتوں کے قریب نہیں جاتا تھا۔ دو منٹ پہلے سے سکھیا کی نظروں میں چمپک کے داغ گویا دھل گئے اور حیرام کا چہرہ بے عیب دکھائی دینے لگا۔ سکھیا سوچنے لگی جس طرح وہ پل دیکھتے رہنے سے وہ چہرہ صاف دکھائی دینے لگا ہے اساری عمر ساتھ رہنے سے شاید یہی متا تھا، تو کس ہو جائے کہ چمپک کے داغ دیکھتے ہوئے بھی دکھائی نہ دیں۔

ہوئے ہوئے دوپہر ہوئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سکھیا نے کاکا کی گتھی میں ہاتھ ڈالا۔ اپنے ہاتھ کو پورا پھیلایا اور اسی پچاسی کے قریب روپے نکال لئے جب عورتیں ہنسنے لگیں۔ بہو پڑی

اسے رہ کر خیال آتا — وہ رسم پر آئے کیوں نہیں؟ ذرا رزق ہو جاتی۔ اگرچہ دل نفرت سے
 ڈگ ڈگ کر رہے تھے۔ لیکن ایسی نفرت کا اور کیا علاج ہے؟ یہی تاکہ اور قریب ہو جائے آدمی۔
 اور کسی کی تمام خامیاں خوبوں میں قید ہوں۔

وہ نہیں آئے۔ انہیں کیسے پہنچ گیا کہ مجھے ان سے نفرت ہے۔ سلکھیا سوچنے لگی۔ جو نبی
 میں نے منہ کے داغ اڑتے دیکھتے چاہے تھے توں ہی وہ میرے سے مار گئے۔ اب آگن میں
 ٹپکنے والے کا منہ پھٹکار کی طرح دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ ازدواجی زندگی کا پہلا دن تھا اور وہ
 چھپک کے داغوں کو اتنا بھول گئی تھی۔ اتنا —

دودھ رضوتی میں قسے پر ایک کوڑیا لے سانپ کی طرح جل کھا تا ہوا آگ میں کرسنے لگا۔
 ہو رہی آپس کی گھڑیا۔ اماں نے میرا کوڑا زدی۔ کا ہو گوا تو کو؟ دودھ ایتنا وانا دکھے؟ رانڈا
 پیسے لگنے کو سر پر چڑھی ملی آدے۔ پیسے نہ دوں گی۔ راکھ بھونک دل لک منہ ماں! اور ماں
 ہلاتے ہوئے منہ کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔

فصو شام کے قریب بچا ایک کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ دودھ بھی دو با جا چکا تھا۔
 چیل کے دوہنے تخت پوش پر رکھے ہوئے تھے۔ کا کا دامادی دوسرے تخت پوش پر بیٹھے ایک لال
 جلد والی بھی پر جلدی جلدی کچھ کھڑے تھے۔ عینک بار بار منہ پر گرتی تھی۔ عینک کے کنارے
 ایک کند سفید رنگ کے ہو گئے تھے۔ کمان کی جگہ ایک دسا کا کان تک چلا گیا تھا اور ٹوٹے
 ہوئے شیشے میں سے کبھی کبھی ایک آری کے ردو دکھائی دینے لگتے تھے۔

گھر کی عورتوں میں بھی ہلکی کھسپ ہو رہی تھی۔ وہ کوڑی لگا ہوں سے حیرام کی طرت
 رکھتی تھیں۔ سلکھیا کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کیوں نہ آئے سلکھیا نے پیرائے آپ سے سوال کیا۔ اور
 اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے بھرتاں ہیل یاد آیا۔ بھر حیرام، کبھی عورتیں حیرام کو کچھ

گھر میں

لہر رہی تھیں۔ گھر کی اماں کی طرح سکھیا کو بھی حیرام کی طرف داری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن..... لیکن..... مندر چہرے پر اگر کالا داغ ہو۔ تو چہرہ اور بھی زیادہ خوب صورت ہو جاتا ہے۔ مرد کماتا ہوا شریف ہو، صحت مند ہو، تعلیم یافتہ ہو تو چہرہ چمپک کے داغ اس کی مندر تانہ جاتے ہیں اور سکھیا اب تک ان چمپک کے داغوں میں خوبصورتی پائے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

رات ہوئی۔ حیر ہوئی کیلئے حیرام کی تگلاش ہوئی۔ لیکن حیرام غائب تھا۔ بڑی سند گھبرائی چوٹی آئی اور بولی۔

”سکھیا بہن! برا نہ منانا، جوانی میں کبھی ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔“

”سکھیا بولی۔ کیا ہٹ دھرمی ہے؟“

”رہی بچپنا ہے نا، تھوڑا وقت گزر جائے گا۔ تو آپنی آپ سمجھ آ جائے گی۔“

سکھیا حیرت سے مندر کے منہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ”جیسی ایہ کابائیں ہیں میری

سمجھ میں ترنا آویں۔“

”کوئی بات بھی جو“ مندر بولی۔ ”حیرام کالج کا پڑھا دے نا، اسے کھیال ہے کہ سکھیا کا

ناک لمبا ہے..... اسی لئے وہ رسم پر نہیں آیا اور اب کہاں لمبا ہے ناک تو مارا؟

..... تھوڑا وقت گزر جائے گا تو آپنی آپ.....“

سہاگ رات اپنے تمام دھڑکے کے ساتھ سر پر آ رہی تھی۔ سکھیا نے چمپک کے داغوں

کو معاف کرنے کی حد سے پرے جا کر اس میں حسن تلاش کر لیا تھا۔ لیکن حیرام اس کے ناک

کو معاف نہ کر سکا اور رات، سرد، اداس، بے خواب رات گزرتی گئی.....

گورتی گئی.....

ایوانش

جب میں کچھ پریشان سا ہوتا ہوں اور مجھے اپنا دل ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کے نیچے دبتا اور میٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو میں اخبار پڑھ کر تھک جاتا ہوں۔ یہ میرا شغل ہے۔

اخبار میں سکون کو تلاش کرنا ایک بنیادِ فہم بات ہے لیکن یہ تو درست ہے کہ اس میں قتل، اغوا اور ایسی قسم کی بیوقوفانہ باتیں دلچسپ ہوتی ہیں اور دوسروں کی کمزوریاں اور مصیبتیں پڑھ کر دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ کے کسی نے کوئی سنگینی خٹائی گلاں چھین لی ہو۔۔۔۔۔ اور پھر کبھی کبھی ہر گز نہیں سے اقتباسات ہوتے ہیں۔

عجیب عجیب ناموں پر مجھے بے حد مہنی آتی ہے۔ مثلاً اس خبر میں :-

”شکریہ کلاڈیو (دکن) ۱۵ دسمبر۔۔۔ کوئلے کی کان میں سخت دھماکا ہونے سے ایک شخص مسمیٰ ہو گیا اور دھماکا دیکھنے والوں کی موت واقع ہو گئی، مہتمم۔۔۔۔۔“

مکرم

اس وقت میرے ہاؤس میں سے سیپراتر جاتے ہیں۔ میں بھول جاتا ہوں کہ میں ایک مہتر آدمی ہوں۔ چاہے جو کہ میں نے ابھی اچھی پی ہے اسی کے چند قطرے میری داڑھی میں اٹکے ہوئے ہیں۔ گورو ناتھ دیکھا رہا ہے۔۔۔۔۔ خدا کی قسم، کیا عجیب نام ہے بابا دانا!!۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ رتو۔۔۔۔۔ خیر، رتو اور میری بیوی جتنا تیز بھاگتی ہوئی آتی ہیں دیکھا اوپ نام ہے، تم نے دیکھا؟۔۔۔۔۔ تم نے دیکھا۔۔۔۔۔ گورو ناتھ دین۔۔۔۔۔ کٹا۔۔۔۔۔ رتہ۔۔۔۔۔ بابا ہی ہی، اور ہم سب بھول جاتے ہیں کہ اس بیچارے کی موت حادثہ سے واقع ہوئی۔ ایک نہایت انسوتاک حادثہ سے، اور موت کی شادی ہوئے ابھی صرف تین ماہ ہی ہوئے تھے۔ جتنا، میری سس بیوی سوچتی ہے، کس طرح بیماری کی سرخ چوڑیاں توڑ دی گئی ہوں گی۔ بھولی نہیں جانتی کہ میں عورتیں سرخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ اگر وہ سوچے کس طرح بیماری کی مانگ بلا سیندر پونچھ دیا گیا ہو گا تو شاید کچھ بات بھی بنے۔ چنا آجمل سے اپنی منانک آنکھوں کو صاف کرتی ہے شبیلا اور تو کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتی ہیں لیکن وہ تینوں پاگل ہیں۔ ہمیں گورو ناتھ کی موت سے مطلب؟ ایک سانس کے ساتھ دنیا میں سیکڑوں انسان سر جاتے ہیں۔ اور پھر ان سے کہیں زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ کوئی رشتہ ہے۔۔۔۔۔ لیکن میرا دل دبا ہوا ہے اور۔۔۔۔۔ خرابی میرا شغل ہے۔۔۔۔۔

اندھ دیوی کے قریب ایک بوٹی کو سر کرنے کے لئے بین الاقوامی افراد پرنٹل ایک پارٹی آ رہی ہے۔ چونکہ آج کل سر دی ہے ہاٹوں پر برنس جی ہوئی ہوگی۔ اس لئے پارٹی کے تمام افراد مغرب ہی پڑھائی شروع کر دیں گے ان افراد میں دوسری میا ایکس اطوری اور ایکس برین عورت ہے۔ نام ایکسی نکولائی کوراشنک۔ ساترہ دھکلو ٹو گینٹی اور جین مورت کا نام فراڈ کرپ۔۔۔۔۔ ہی ہی۔۔۔۔۔ ہی!!

گرمی

موضع ہندال میں ایک معزز کھڑوبہ خاندان کے ہاں برات آئی۔ لوگ والوں نے
جہیز میں بھینس تو لے سونا، ایک ہزار روپیہ نقد، فرنیچر، بھینس اور بہت کچھ مال و
دولت دی۔ پھر سے کے بعد لڑکے نے اپنے سسرال سے کارائیگی۔۔۔۔۔

پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد میرا دل کا اپنے ٹکٹے سے ٹانگیں ڈنگ لگنے لگتی ہیں۔ آنکھوں پر سے
عینک گر پڑتی ہے۔ اخبار چھوٹ چھوٹ جاتا ہے۔ بس اسی طرح بیٹے تماشا آوازیں دیتا ہوتا
شیلا، رتو، جتنا۔۔۔۔۔ ادھر آنا۔۔۔۔۔ کوئی نہیں آتا یہ لڑک میری دیوانی مادیوں سے
واقف ہو چکے ہیں۔ گویا وہ مجھے میرے اخبار کے آخری کالم اور میری زندگی کے آخری
مائنس تک اکیلا چھوڑ دیں گے، تنہا بلے بارود دگا رہا دیوانہ۔۔۔۔۔ کیا کوئی کسی کا بیٹے؟
..... یومی اور بیٹے۔۔۔۔۔ رتو آ جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں اسی طرح نمناک ہوتی ہیں۔ وہ
اخبار کو پڑھتی ہے، اور پھر آہستہ سے میرے کندھے کو چھوتے ہوئے کہتی ہے :-

”پتا ہی۔۔۔۔۔ آپ سے آگے بھی پڑھا؟“

”نہیں تو، بیٹی“

”پڑھئے۔۔۔۔۔ یہاں سے۔۔۔۔۔ انکار کر دیا اور آگے۔۔۔۔۔ ہاں ہاں یہ یہ“
اور تو کی چھینکلی سطر کے ساتھ ساتھ دوڑتی باقی سطر کے الفاظ گم ہو جاتے ہیں۔
کہیں کہیں اعراب ناچنے لگتے ہیں، ضرورت سے زیادہ جیسے ہو جاتے ہیں۔

لڑکے نے اپنے سسرال سے کارائیگی۔ لوگ والوں نے اسے اپنی توہین سمجھنے
پرے انکار کر دیا اور ڈولی روک لی۔ برات کو ناکام واپس لوٹا پڑا اور ندامت
سے اپنے تئیں بچانے کے لئے دولہا والوں کو خوشہ کی ضلع جہلم کے ایک گاؤں
میں ایک اعلیٰ جاہل و بیانی لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔

گرہٹ

— اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا راجہ ہے —
 بہت بڑا فرعون، استبدادی، جس کے ہاتھوں کسی کی بھی عزت محفوظ نہیں، اس کی رعایا نے
 اس کے حدود استبداد سے تنگ آکر ہتھیار اٹھائے ہیں — لامبیاں، گنڈلے، ذرا تہیاں
 ہتھوڑے... بہت ہی اچھا کیا، میں کتا ہوں، لڑکی والوں نے بہت ہی اچھا کیا!

میرے مکان کی گھنٹی بجی میں جانتا تھا صاحب رام آتے ہی ہوں گے۔ کپورا اڑ معافی
 گھر میں بڑی ادنیٰ ذات ہے۔ یہ۔۔۔ دواڑہ کھولنے سے پہلے مجھے پر سے جھانک لیا۔
 یوں ہی — وہی تھے — کپورا امرتسری طرزی سیدھی سی، شستی نما پگڑی بندھی ہوئی
 تھی۔ کالا بند گلے کا کوٹ اور اریب پا جا مر، شانے پر شال رکھی تھی۔

میں نے جھنا کو بلایا اور پوچھا۔

”گدے تبدیل کئے ہیں جھنا؟“

”وگدے؟ ہاں تو کئے ہیں... نہیں کئے صرف ان کے خلاف...“

”بھولداں؟“

اس دفعہ رتو آگے آئی۔ وہ جانتی ہے تاکہ میں اس کی ماں سے خواہ مخواہ کٹا رہتا
 ہوں کسی کی بات کا قصہ اس پر نکالتا ہوں... شاید اس لئے کہ میں اس سے بہت
 محبت کرتا ہوں، اور اس سے بہت کچھ متوقع ہوں۔

رتو ہلکی ”کھدیتے ہیں بھولداں...“ اور اپنے کاڑھے ہر بے

میز کپش بچھا دیئے ہیں۔

اس وقت نہ جانے مجھے اپنی ٹیٹی میں کیا دکھائی دیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔

گرہن

ایک دیوانے کے آئینہ دار کے ہاتھ رتو کے سر پر بچا گئے۔ رتو نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ گویا آنکھوں کے راستے سے وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر جانا چاہتی ہے۔ ماری بھولی لڑکی! کیا یہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترنے کا وقت ہے؟ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو تم تینوں میں سے میرے پاس کوئی نہیں آتا، کوئی بھی میرے جذبات کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ میری پرداز کے ساتھ نہیں اڑتا۔ تم سب مجھے سطحی سمجھتے ہو اور یہی تمہاری بھول ہے۔ باہر کچھ کھڑے ہیں، اناڑوں میں سوئے ہوئے ہیں۔ میں نے رتو سے مخاطب ہوئے ہوئے کہا: تم سب اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ جاؤ۔“

صاحبِ دم آتے۔ جسم کے بھاری بھوکم تھے۔ نتھنے ضرورت سے زیادہ فراخ تھے۔ بھوئی زیادہ لمبی تھیں اور کانوں پر لمبے لمبے سخت سے بال اُگ کر لڑی سے باہر دکھائی دے رہے تھے۔ ماتھا اندر کی طرح دھنسا ہوا تھا۔ بس بالکل کال روپ تھے۔ بار بار مثال کو سنبھالتے تھے۔ گویا اس کا نظاہرہ کو نا کوئی بہت ضروری بات تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ کچھ دیر رتو کے ہاتھ کے کونے پر سوا گئے (خوش آمدید) وغیرہ کو دیکھتے رہے۔ پھر تصویروں پر نظر دوڑائی اور نہایت احتیاط سے کرسی کو میرے قریب سرکاتے ہوئے بوسے۔

”سب سے پہلے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔“

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے کہا: ”معافی۔ آپ کا غلام ہوں۔ دیکھئے نا، دوست بہتہ غلام، آپ ہمارے صاحب ہیں، یہ رشتہ ہی کچھ۔“

صاحبِ دم سرکائے جیسے کچھ کر رہے ہیں اور بوسے میں نے سنبھالے۔ آپ کی رتو کی دوسری رنگائی ہوئی تھی؟

اس وقت میں نے دروازے کو کھینچا۔ کھینچتی ہوئی دیکھی۔ وہ مجھے اثبات میں جواب

دینے سے منع کر رہی تھی۔ پھر اس کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دینے لگی۔ جیسے تھیں ایک پامپٹر
یوتا ہے۔ لیکن پڑ پڑکا ہنسا می بات میں ہے کہ حاضرین کو اس کے دھوکا پتہ نہ چلے اور
صاحب رام سن رہے تھے ہیں حقیقت سے اتنی جلدی اٹکار نہ کر سکا۔

نہا نے کہا ”جی ہاں“

صاحب رام بڑے خود باز انداز سے بولے ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ لگائی ٹوٹ کیوں گئی؟“
اس وقت میرے منہ میں لعاب خشک ہو گیا۔ رتنے لکھان اچھی طرح رکھے
اور پھر اس سلیقہ سے کارٹسے تھپے۔۔۔ میں نے اپنی دائرہ کو کھاتے ہوئے بتایا۔
”وہ اس دہے چھوٹ گئی کہ میں ایک غریب وراثت لائن انکپٹر ہوں۔ رتنو کو میں نے پڑھایا ہے
لکھا یا ہے، اچھی تعلیم دی ہے۔ آپ ایک غریب وراثت لائن انکپٹر سے کیا توقع ہو سکتے ہیں
کیا وہ اپنی بیٹی کو تعلیم کے لئے آکسفورڈ بھیج دے گا؟ معاف رکھئے۔۔۔۔۔ باقی رہی دینے
دلانے کی بات، میں نے رتنو کو سقاطعت سے زیادہ دینے کے لئے خاکر دہوں، جہاد میں
سب ماتحتوں کے منہ سے نسا لے چھینے ہیں۔“

غنی محلہ میں نکالیاں بنانے کا ٹھیکہ ہتھاب ٹکھ کو دو کر اس سے ایک کافی بڑی رقم
انچھی ہے ادب اس کا پتہ حل چکا ہے۔ میرے بیان ہو چکے ہیں۔ میری نوکری میری میرے
بچوں کی، میرے دو تھیم بھتیجیوں کی زندگی خطرے میں ہے اور چو کہ میں بہن میں زیادہ دینے
کے اہل نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ رشتے ٹوٹ گئے، ٹوٹ گئے، سنا آپ نے؟“

صاحب رام نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے ان سرخ ڈوڈوں سے
سبزی ہوتی لگا ہوں ہیں ایک مٹہ پیدا کر مینے دالے معافی نظر آئے۔ گو وہ میری رتنو کو شکوک
چال ملین سمجھتا ہو۔۔۔۔۔ رتنو۔۔۔۔۔ میری بیٹی رتنو کیا ایسی بھی ہو سکتی ہے؟۔۔۔۔۔ میرے

گرمین

ماہقرین ریوالور ہمد تومیں صاحب زلم کا داغ پش پش کردوں۔

صاحب ہونے یا سردار صاحب دیکھنے میں کل بینک میں لوگ سے ملاقات اس بات پر بعد ہے کہ ایک ہزار روپیہ بد انگلی میں رکھا جاتے۔ فرنیچر سب کلاس مانگوانی ہو۔ ریڈیو اور اگر ایک ریفریجریٹر.....؟

باقی کا میں نے نہیں سنا۔ سہرے آخری الفاظ صاحبِ رام کے چلے جانے کے بہت عرصہ بعد تک میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ ”اچھا، بامرزگ مارو گئے آج کل سنے کہاں ہیں؟“... مجھے یاد آیا، میری نوکری، میری زندگی — چھ زندگیاں خطر سے میں ہیں اور شاید ایک دفعہ ایک راجہ کے جوہر منبہاد سے تنگ آکر فرمایا نے بغاوت کی قیامت اور محل کے نیچے لاشیاں، گنداسے اور امتیاں، ہتھوڑے... اچھا کیا... اچھا کیا!!

برسات کے دنوں میں دیوار کی لکڑی کے سامں پھیل جاتے ہیں اور دروازے ٹھیکڑ
کے ساتھ جھٹ جاتے ہیں۔ میں نے زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازے کے پیچھے رتو
اسے پیچھے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دروازہ پٹ سے کھلا اور رتو کی پیشانی
کے ساتھ ٹکرایا۔ اس وقت میرا جی جا ہا کہ بس رتو کی خوب لاتوں، گھونسلوں سے مرمت کروں،
خوب اردوں اُسے۔

لیکن ایک اور ہی جذبہ میرے دل میں عود کر آیا۔ انسان اپنے دل اور کردار کے مستقل قیود نہیں جانتا کہ فلاں وقت میں کونسا جذبہ، کونسا عمل سب سے اوپر چلے پاتے گا۔ میں نے تو کئے سر کو سہلاتے ہوئے کہا تھا، رہا، میری بچی... زیادہ تر نہیں آئی۔ چوٹ ہے؟“ میں نے دیکھا کہ تو کو چوٹ کا ذرا بھی نیالی نہ تھا۔ وہ کسی گہری صبح میں غرقِ غمی، یادہ

گرمی

کسی اور ہی چوٹ کو سہارا ہی تھی۔ اس نے آنکھیں بستور فرش پر گلاڑے ہوئے پر بچاؤ وہ کیا کہتے تھے؟“ اور پھر وہ کچھ شہر اسی گئی۔

———— ایک پرامیٹر کے بغیر میں نے سب کچھ چھپا لیا۔ میں نے کہا میں رتو کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے سوچا۔ کوئی تعجب نہیں کہ رتو خود ہی دروازے کے پیچھے سنٹی رہی ہو۔ لیکن میں رتو کو کیوں بتاؤں؟ اس کی وہی چھٹی ایک دن پڑوان کی ایک خبر پر دوڑ رہی تھی۔ اس خبر میں لکھا تھا..... اپنے باپ کی مجسوریوں کا خیال کرتے ہوئے ایک لڑکی نے اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگائی۔ میں نے رتو کو بالکل بچہ سمجھتے ہوئے گود میں بٹھالیا۔ پہلے خود شرادی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے دل کی گرائیوں میں اترنے لگی۔

میں نے کہا ”وہ کہتے تھے لڑکی تو بہت سوشل دکھائی دیتی ہے..... پوچھتے تھے یہ بھول اسی نے گلاڑے میں۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ کہنے لگے کیا خوب ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ پھر بولے۔ رقتن بہت اچھے اخلاق اور اطلال کی سنی جاتی ہے..... میں نے کہا..... ہاں.....

اور اس سے زیادہ میں نے کچھ نہ کہا۔ میں کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ جانے مجھے کسی نے زور سے گلے سے پکڑ لیا ہو۔ کچھ دیر بعد اپنے اہل کو چھپانے کے لئے میں نے رتو کو دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا ”جاؤ..... رتو جاؤ..... جب میں اکیلا ہوتا ہوں۔ تو تم میں سے کوئی بھی میرے پاس نہیں آنا۔ کوئی بھی میرے دل کی گرائیوں میں نہیں اترنا۔ کوئی بھی میری پرداز کے ساتھ..... کیا میں سٹھی ہوں بے وقوف..... اور جب میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ تو تم سب میرے پاس آ جاؤ گے

گورن

باؤں مجھے اپنے اخبار کا آخری کالم اطمینان سے پڑھتے دو۔۔۔۔۔ ہاں !
 ہنسائے کہ دنیا ایک ایٹمی میں بہت سے کونے ڈال کر بیچ دے۔ حرا سزا دی کہ میری
 ذرا پروا نہیں۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔ آج مجھے بہت سر دی لگ رہی ہے
 ۔۔۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔۔۔ مرا جاتا ہوں مار سے سر دی کے ۔۔۔۔۔

رقومہری عادت سے واقف تھی۔ چپ چاپ چلی گئی۔ آپ ہی نمٹیں لے آئی۔
 میں نے اخبار کو اٹھایا۔ وہ بین الاقوامی افراد پرستل پارٹی کنس جٹگایا مندہ دیوی کے
 زیر یکسی چوٹی کی بند یوں کو سر کر رہی تھی۔ چاروں طرف ہر ہر ہی روت تھی۔ یکا یک
 رت کا ایک تودہ ہمسلا ایک بڑی سی ایوانشس نے انہیں آلیا۔ پارٹی کے سب ممبرز چند
 نئی مزدور انجیر حب د ب گئے۔ شاید سر بھی گئے ہوں گے۔

حبيب الہدایہ آتی ہے۔ تر بڑے بڑے درختوں، چھوٹے چھوٹے
 ہر نخل و شجر کو ہاتھ ملاتی ہے۔ گلوں کے گلوں تباہ ہر جاتے ہیں انسان
 ریشی، پرندہ سہاتے ہیں فصلیں تباہ ہر باقی ہیں۔ قحط سالی ہوتی ہے۔۔۔
 اس وقت ان افراد کے نام پڑھ کر میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ایکسی
 ولانی کو رائیگن، سائبرو ٹکو، گینگنی، ارر جمن عورت فراڈ کرپ، لی ٹن ٹانگ۔۔۔
 لیکن مجھے سنہی نہ آئی۔

اس کے دو تین دن بعد بہت سردی پڑی۔ میرا دل مچھایا ہوا تھا، مجھے زکری
سے برطرف کر دیا گیا تھا۔۔۔ رشوت لینے کی وجہ سے..... زکوٰۃ کی
اشی ٹیوشن کو رٹی طنز یہ نگاہ سے دیکھنے لگی۔ مجھے تو اس کی عادتوں میں بے اعتدالی

دکھائی دینے لگی۔ مجھے تو اس کے چہن پر بھی شبہ ہونے لگا۔ . . . ہنا امیری دو بیٹیوں و تین بیٹیوں کی زندگی خطرے میں تھی۔ . . . اسی دن رتو وڑی دوڑی آئی۔ اس کے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ وہ بولی دیکھا آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟" میں نے کہا "نہیں"۔ . . . اس نے ایک کلمہ میری آنکھوں کے سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا۔ ایک ہوائی کوڈر کے تحت میں ایک ریکیو پارٹی نے اپر انش کی زمین آئے ہوئے سب آدمیوں کو بچا لیا۔ میں نے تسکین کا ایک گہرا سانس لیتے اور اس برفانی سخت مسوی میں اپنے رخ بستہ ہاتھوں کو سینک سینک کر دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ دیکھا کوئی ریکیو پارٹی آئے گی؟ . . . رتو . . . کیا وہ ہمیشہ آتی ہے؟"

MEHRAN LIBRARY
B-61, Lhringora Town
Azizabad Karachi
TIME 6 to 10 pm.